Balucea

شخصیت و فن

حکیمِ بلوچ

محمد یٰسین بلوچ

3/8/2016
Panjgur

حکیم بلوچ

شخصیت و فن

محمد یٰسین بلوچ

BALUCEA LUVZANK PUBLICATIONS QTA
بلوچیہ لوزانک پبلیکیشنز کوئٹہ بلوچستان

بلوچیہ لوزانک پبلیکیشنز

99A/E2 بلاک نمبر 4 سیٹلائیٹ ٹاؤن کوئٹہ بلوچستان (فون: 081-2452256)

کتاب: حکیم بلوچ (شخصیت وفن)

مصنف: محمد یٰسین بلوچ

اشاعت اوّل: 2011ء

کمپوزنگ: العابد کمپیوٹر گرافکس مشن روڈ کوئٹہ

تعداد: 500

پبلشرز: بلوچیہ لوزانک پبلی کیشنز۔کوئٹہ

قیمت: 180/-

ڈسٹری بیوٹرز: سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ

(فون 081-2820375 / 081-2843229)

ISBN-978-969-8932-07-7

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ محمد یاسین رول نمبر ٦ نے میری نگرانی اور راہنمائی میں یہ محققانہ مقالہ " حکیم بلوچ شخصیت وفن" کے عنوان سے تیار کیا ہے جو اپنی نوعیت کی ایک معیاری تحقیق ہونے کے پیش نظر قابل منظور ہے۔

نگران:۔ جناب ڈاکٹر آغا محمد ناصر صاحب چیئرمین شعبہ اردو

انتساب:

پیارے ابّو جان کے نام
جس نے میری زندگی کی کشتی کو
ہر طوفان کی بے رحم موجوں سے
تحفظ فراہم کیا۔

پیاری امّی جان کے نام
جس نے مجھے قلم و قرطاس تھما کر
باعزت زندگی جینے کا حوصلہ بخشا۔

اظہار تشکر

مجھ سے یہ خارج از اخلاق وادب فعل کا سرزد ہونا زمرہ محال میں ہے کہ میں اپنے مشفق ومکرم معلمین اور معلمات کی ادائیگی تشکر میں نسیان برتوں، جن کی بدرجہ اتم راہنمائی سے میرا یہ تحقیقی مقالہ اب تیار صورت میں میرے سامنے موجود ہے۔

ڈاکٹر آغا محمد ناصر صاحب میرے استاد ہونے کے علاوہ نگران کی حیثیت سے بھی ہمہ وقت میری راہنمائی کرتے رہے۔ گزشتہ سال محترمہ افشاں قاضی نے بھی تحقیقی مقالے سے متعلق میری کافی راہنمائی کی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر خالد محمود خٹک صاحب نے بھی مجھے کما حقہ تجاویز وآراء سے نوازہ ہے۔ محترمہ شگفتہ ضیاء نے بھی مجھ پر کافی محنت کی ہے۔ خصوصاً جناب دانیال طریر صاحب نے قدم بہ قدم اپنے ہادیانہ مشوروں اور راہنمائی سے مجھے علمی وتحقیقی لعل وگہر کے خزانوں کو پانے کے اسرار ورموز سے آشنا کیا اس ضمن میں، میں اپنے سب محسنین ومعاونین کا تاابد دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور وممنون رہوں گا۔ انشاءاللہ

محمد یٰسین بلوچ

فہرست

باب اول

تعارف حکیم بلوچ

باب دوئم

حکیم بلوچ اور فکر و ادب

باب سوئم

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری

باب چہارم

حکیم بلوچ اور ادباء و ناقدین کی آراء

اور حکیم بلوچ کے چند اہم انٹرویوز میں سے ایک یادگار انٹرویو

باب پنجم

نتائج و ماحصل

پیش لفظ

شرح خواندگی اور علم وآگہی کے حوالے سے مکران اور خصوصاً پنجگور کی سرسبز وشاداب وادی، دریائے رخشان کے کنارے آباد" دوازدہ شہر پنجگور" 12 بارہ شہر (قصبہ) (جنکی تعداد اب خاصی بڑھ چکی ہے) جہاں تہذیب وتمدن علم وآگہی اور روایات کی اپنی ایک تاریخ ہے جہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماہر تعلیم، قلم کار، بیوروکریٹ، ادبأ اور دانشوروں کی ایک کھیپ نے علم وادب کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں ایک نمایاں نام واجہ عبدالحکیم بلوچ ہیں۔ جو بیک وقت ایک ادیب، دانشور مفکر، مترجم، تجزیہ نگار اور تنقید نگار کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق ایک علمی، ادبی اور دینی گھرانے سے ہے اس لئے بچپن ہی سے انہوں نے اسکا بھرپور استفادہ کرتے ہوئے علم وادب کی راہوں میں قدم رکھا اور آگے بڑھتے رہے وہیں سکول کے زمانے سے ہی اساتذہ کی شفقت ورہنمائی نے ان کی علمی وادبی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جب وہ اعلیٰ تعلیم کیلیئے کوئٹہ آئے تو عطا شاد صدیق آزاد، امان اللہ گچکی، صورت خان مری، کریم دشتی، غلام محمد شاہوانی، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی، اور دیگر ادبأ اور قلمکاروں کا ایک کاروان بنتا چلا گیا۔ جہاں انہوں نے شعوری طور پر ادب خصوصاً بلوچی زبانِ وادب (جو اپنے باقاعدہ تحریری دور کی ابتدا کر چکی تھی) کی ترقی وترویج کیلیئے مختلف محاذوں پر کام کرنا شروع کیا۔ ایک طرف تنقیدی نشست اور ادبی دیوان منعقد کیئے گئے تو دوسری طرف مطالعہ، خصوصی طور پر ترقی یافتہ ادب کے مطالعے، پر توجہ دیتے ہوئے

پروفیسر کرار حسین جیسے ادیب، دانشور اور مفکر سے اپنی علمی وادبی پیاس بجھاتے رہے۔

1961ء میں ''اولس'' بلوچی میں لکھنے کے ساتھ ساتھ بعد میں اولس کے کے ایڈیٹر بھی رہے۔ جہاں اس رسالے کے معیار کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ترقی یافتہ ادب کو بلوچی کے قالب میں ڈھالتے ہوئے یہ کوشش کی کہ بلوچ ادباء اور شعراء ترقی یافتہ ادب سے روشناس ہوتے ہوئے اپنی تخلیقات کو صحیح سمت دے سکیں۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حکیم بلوچ اور ان کے ہمسفر قلم کاروں نے بلوچی زبان وادب کے ابتدائی دور میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں اور نئے آنے والوں کیلئے راہوں کے تعین میں اہم کردار ادا کیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حکیم بلوچ نے اپنے علمی وادبی سفر میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں تنوع، گہرائی اور گیرائی ہی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اب تک بلوچی، اردو، اور انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں شبیہ شاد، ماتم دانش، بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت، **cobra's evotive kiss, tears of Resurrection** کاندیت، دروش جتین ارواح، آس ءِ چہر، سنگ گراں اور دیگر کتابیں شامل ہیں۔

انہوں نے فکشن کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید نگاری بھی کی ہے، ڈارمے لکھے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست پر تجزیہ نگاری کے ساتھ ساتھ ملکی اور سیاسی حالات خصوصاً بلوچستان کے مسائل پر تجزیے اور تبصرے کئے ہیں۔ جن سے بلوچستان کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

حکیم بلوچ ''شخصیت وفن'' کے حوالے سے نوجوان لکھاری اور ادب دوست، محمد یلیین بلوچ نے قابل قدر کام سرانجام دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حکیم بلوچ جیسے ادیب، دانشور اور اہل علم پر لکھنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ نئی نسل کو یہ بتایا جائے کہ ماضی میں زبان وادب کی کیا صورت حال تھی کیا مشکلات تھے کیا رویے تھے۔ انہوں نے کیا تجربات کئے، کیسے اور کس طرح علم وادب کے گلشن کی آبیاری کی۔ اس کے علاوہ ہمارے جو معروف ادباء اور شعراء گزرے ہیں اور جو بقید حیات ہیں

ان کے حوالے سے تحقیق کے کام کو کیسے اور کس طرح آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔جس سے زبان وادب کی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ کے ساتھ ساتھ ادب میں ان اہل علم وسخن کے مقام کے تعین میں بھی مدد مل سکے۔

میں محمد یٰسین بلوچ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ''محققانہ مقالہ'' جو اب کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آرہا ہے، کیلئے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے میں سمجھتا ہوں حکیم بلوچ جیسے ادیب اور دانشور کے حوالے سے کچھ لکھنا میرے جیسے ادب کے طالب علم کیلئے آسان نہیں۔اور مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہے، لیکن برخوردار محمد یٰسین بلوچ کی دلی خواہش پر یہ چند سطریں رقم کر رہا ہوں۔

اس ''محققانہ مقالہ'' میں حکیم بلوچ کا خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم، ملازمت، مختلف علمی وادبی اداروں سے وابستگی اور ممبر شپ، بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی، شائع شدہ اردو، بلوچی اور انگریزی تصانیف، غیر مطبوعہ کتابیں، فکشن نویسی، ڈرامہ نگاری، ادبی تنقید نگاری، ملکی اور غیر ملکی سیاست پر تجزیے اور تبصرے اور حکیم بلوچ پر ادباء اور ناقدین کی آرا شامل ہیں جہاں آغا محمد ناصر شعبہ اردو جامعہ بلوچستان اور نوجوان شاعر دانیال طریر نے خصوصی طور پر محقق کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہے۔

محمد یٰسین بلوچ کی یہ کاوش واجہ حکیم بلوچ پر مستقبل میں کام کرنے والوں کیلئے تحقیق کے دروا کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر علی دوست بلوچ

شالکوٹ ۱۲ جون ۲۰۱۱ء

عرضِ حال

ہم اپنی قابلیت وصلاحیت کے اس حد تک دعویدار ہیں کہ ہم زیرارض ناپیمودہ خزینے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ہم سمندوروں کی بھیدوں سے آشنا ہیں اور دست نخوردہ ہیرے بھی تلاش کر سکتے ہیں مگر عجیب اور قابل غور امر تو یہ کہ مادرارضی کی بالائی سطح پر ایسے علمی وفکری خزینے اپنا وجود رکھتے ہیں جو کسی صحرا میں تپتی دھوپ پر کسی تراشیدہ وآمادہ ہیرے کی طرح چمکتے ،دمکتے اور بکھرتے نور کے ساتھ جلوہ انگیز ہونے کے باوجود،ہم ایک رجل نابینا کی مانند اس طرح غافل راہ گزاری کا ثبوت دیتے ہیں کہ گویا ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔مگر تاریخ آذان دیتی ہوئی ہمیں اس نکتے کی جانب بلا رہی ہے جہاں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ جن شعوب وقبائل نے اپنی اہم شخصیات کی قدر نہیں کی ہے اوران سے محبت نہیں برتی ہے تو ان کی قدر بھی دوسری اقوام کے سامنے بچ رہی ہے اور جن اقوام نے اپنی علمی اور دانشور ہستیوں کی قدر کرتے ہوئے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے تو وہ ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی منظم،طاقت ور اور باوقار قوم نظر آتی ہیں۔پھر ایسی قوموں کی آزادی وخودمختیاری اور ان کا حق دنیا کی کوئی بھی طاقت چھین نہیں سکتی کیوں کہ یہ بات دنیا پر مطلع الصبح کی طرح عیاں ہے کہ جب بھی کسی طاقت نے اہل علم ودانش قوم کی آزادی وخودمختیاری کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی کی تو اس قوم کے دانش مندوں نے اپنے دشمن کی حقیقت کو نہ صرف پوری دنیا کے سامنے عریاں کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کو بھی ایک ایسا فکری،شعوری،انقلابی اور مزاحمتی جذبہ عطا کیا ہے جس سے ایک لازوال تحریک نے جنم لیا ہے جس کی

تابنا کی نے دشمن کی ناک میں دم کر دیا ہے اور دشمن کی طرف سے طرح طرح کے پاپڑ بیلنے کے باوجود متحرک جدو جہد پیہم برس کر اس وقت تک نہ کھلا ہے جب تک آزادی وخودمختاری کی دیوی نے دوبارہ اہل لوح وقلم کے دروازے پر دستک نہیں دی۔

بلوچستان میں فضل الٰہی سے بہت بڑی اور معتبر علمی وادبی شخصیات کی بہتات نظر آتی ہے اور ان اہم شخصیات میں ایک ممتاز شخصیت حکیم بلوچ ہیں جن کی تنظیمی، انتظامی اور علمی وادبی خدمات نصف صدی کے زائد عرصے سے ارض مادر کی آغوش میں پھول برسا رہی ہیں۔ جن کو بلوچستان کے ہمسایہ صوبوں کے علاوہ بیرونِ ملک خصوصاً یورپی ممالک میں بھی سراہا گیا ہے۔ مگر مجھے اپنے ہی لوگوں سے انتہائی جھجک اور معذرت خواہانہ لہجے کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تاہنوز ہمارے اہل قلم حلقے میں ایسا کوئی رجحان دیکھنے میں نہیں آیا ہے جو پورے انصاف اور پوری نیک نیتی کے ساتھ حکیم بلوچ کو دریافت کرنے میں مخلص نظر آتے ہوں۔ جو نہ صرف حکیم بلوچ کی شخصیت کے ساتھ ایک غیر منصفانہ رویہ ہے بلکہ یہ امر ہماری سرزمین کے لئے بھی کسی خسارے سے کم نہیں ہے، کیونکہ ایک ایسی شخصیت جو پوری دنیا میں ہمارے خطے کی ایک عظیم پہچان بن سکتی ہے، مگر ہم نے اس جتن میں اپنا حصہ نہیں ڈالا۔ قطع نظر اسکے کہ حکیم بلوچ نے اپنی ہی صلاحیت اور بے لاگ قابلیت کے بل بوتے پر تقریباً بیس سے زائد ممالک میں ہمارے خطے کی نمائندگی کی اور ہمارے ترجمان بننے کا ثبوت پیش کیا۔ اور اسکا ہمیں علم تک نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر ہمیں اپنے خطے کے علامتی خزینوں کو تلاش کرنے اور تراشنے کی ہمت ہوتی تو دنیا کو دکھا کر فخر سے سر بلند کرتے۔ مگر ہمیں ان سے کوئی غرض اور دلچسپی نہیں ہے۔ اب جو شخص خود اپنے خطے اور اپنے وطن کی پہچان آپ بننے کا ذریعہ بنے تو بھلا اس سے ہمیں کیا غرض اور کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اسی احساس کے پیش نظر میں نے اردو ایم۔اے کے لئے ان پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ جس کو اب کتاب کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تا کہ حکیم بلوچ کے فن اور شخصیت کے بارے میں ان کو آگاہ کرسکوں اور اس تجسس کو جگا سکوں جو آپ پر مزید لکھنے کا موجب بن سکے۔

مجھے اپنے استادان گرامی اور ہمعصر قلم کاروں سے یہی امید ہے کہ وہ میری اس کتاب پر

بے لاگ تنقید کرتے ہوئے اس سے بہتر کوئی ایسی کتاب لکھیں گے کہ جو حکیم بلوچ کے فن اور شخصیت کی جملہ جہات کو زیادہ بہتر انداز میں اجاگر کرے گی۔

محمد یٰسین بلوچ

بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

۱۰ جون ۲۰۱۱ء

باب اول

تعارف عبدالحکیم بلوچ

تعارف

پیدائش و خاندانی پسِ منظر:

عبدالحکیم بلوچ نے 25 دسمبر 1942ء میں بلوچستان کے ایک اہم اور نخلستانی خطہ پنجگور کے قصبہ گرمکان میں ایک زمیندار گھرانہ کی معتبر شخصیت میر نور محمد کے ہاں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد بزرگوار مکران ملیشیاء میں کوٹ حوالدار تھے۔ جو اس وقت سینئر اسٹاف آفیسر کا عہدہ تھا۔ وہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ گورنمنٹ مڈل سکول پنجگور میں ڈرل ماسٹر مقرر ہوئے۔

حکیم بلوچ صاحب دادزئی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کی نسل سات پشتوں سے ہوتی ہوئی میر حمل جیئند کلمتی سے جا کر ملتی ہے۔ میر حمل کلمتی بہت بڑی تاریخی شخصیات کی فہرست میں شامل ہیں۔ انہوں نے ساحل سمندر سے لیکر شال[1] تک اور شال سے لیکر کرمان، اور کرمان سے ہورمز تک یعنی موجودہ بندر عباس تک ایک پروٹو ٹائپ بلوچ کانفیڈریٹ اسٹیٹ[2] تشکیل دی تھی اور کلمت[3] کو پایۂ تخت بنا کر امور سلطنت چلاتے رہے، لیکن اس کی سلطنت کو سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے حملہ کر کے ختم کر دیا۔

حکیم بلوچ کا پورا گھرانہ علم اور تعلیم سے بہرہ مند گھرانہ ہے آپ کے چار بھائی احمد رضا

---

[1] اس وقت کوئٹہ کا نام شال تھا

[2] خلافت بنو عباس طرز کی ایک سلطنت

[3] پسنی کے ایک ہمسایہ علاقے کا نام

بلوچ، احمد خان بلوچ، شبیر احمد بلوچ اور مایہ ناز اسلامی اسکالر پروفیسر عبدالحمید بلوچ (مرحوم) بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے آپ کی شادی 24 اکتوبر 1967 میں پنجگور ہی کے ایک عالم گھرانے میں ہوئی حکیم بلوچ نے گورنمنٹ ہائی سکول پنجگور سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جوان دنوں پنجاب کے تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ بعد میں آپ کوئٹہ آئے اور اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کیا۔ یہاں نہ صرف آپ نے اپنی شخصیت کو روشن پہلوؤں سے مزین کیا بلکہ آپ نے اپنی چار بیٹیوں اور سات بیٹوں' میر بالاچ 'میر شےء حق، میر شئے مزار، میر بہرام، میر شئے مرید، میر سادات اور میر مراد کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ آپ کی ایک صاحبزادی ڈاکٹر شہناز امریکہ میں پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں پی ایچ ڈی کی طالبہ ہیں جبکہ ایک دوسرا صاحبزادہ امپیریل کالج لندن میں زیر تعلیم ہے[1]۔

ابتدائی تعلیم:

حکیم بلوچ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کا ماموں مولوی عبدالواحد ایک بلند پایہ علمی و ادبی شخصیت گزرے ہیں۔ ان کی مختلف النوع کتب سے بھری لائبریری سے حکیم بلوچ نے خوب علمی استفادہ کیا اور اپنی ابتدائی تعلیم اپنے ماموں مولوی عبدالواحد ہی سے حاصل کی۔ آپ اپنی کتاب "ماتم دانش" اشاعت اول میں کتاب کو اپنے ماموں مولوی عبدالواحد کے نام کرتے ہوئے انتساب اول میں لکھتے ہیں۔

"میرے معلم اول اور ماموں مولوی عبدالواحد صاحب کے نام جنھوں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا اور حرمت حرف و تقدس لفظ سے آشنا کیا ہے"[2]

حکیم بلوچ نے تین سال کی عمر میں اپنے محلے کی ایک عالمہ اور طاہرہ خاتون سے قرآن شریف ختم کیا۔ اس کے بعد جب آپ نے اسکول میں داخلہ لیا تو صبح آپ اسکول جاتے، شام کو مدرسے

---

[1] حکیم بلوچ پہلا انٹرویو: جمعۃ المبارک 2010-10-1 دن 12 بجے بمقام مشرق اخبار دفتر

[2] ماتم دانش اشاعت دوئم حکیم بلوچ ص ۳

میں پڑھتے اور رات اپنے ماموں مولوی عبدالواحد کے ساتھ پڑھتے۔ آپ بہت ذہین طالب علم تھے آپ نے میٹرک کا امتحان 1957ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول پنجگور سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور آپ نے پورے بلوچستان اسٹیٹس یونین سے فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لئے آپ نے 1957ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ایف۔ایس سی میں داخلہ لیا۔ لیکن اسکول میں سائنس کے استاد نہ تھے۔ اس لئے وہ ابتدا میں سائنس کی تعلیم نہ پا کر سائنس میں کامیاب نہ ہو سکے تو آپ نے دو سال بعد آرٹس میں پرائیویٹ امیدوار بن کر اور اچھے نمبروں سے ایف۔اے پاس کیا۔ کالج میں ان کے نمبر سب سے زیادہ آئے لیکن رول آف آنر کے بورڈ پر آپ کا نام نہ آسکا کہ وہ کالج کے باقاعدہ طالب علم نہ تھے۔

اعلیٰ تعلیم:

حکیم بلوچ نے اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ہی حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے 1963ء میں آپ نے گریجویشن کیا۔ کالج اسی یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ 1966ء میں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ 1982ء میں آپ انگلینڈ تشریف لے گئے اور آسٹن یونیورسٹی برمنگھم (Birmhingam) میں زیرِ تعلیم رہے جس کے بعد آپ دوبارہ پاکستان آئے اور 1983ء میں آپ نے جامعہ بلوچستان سے LLB کیا۔[1]

ملازمت:

حکیم بلوچ کی ملازمت کے سفر کا آغاز 1963ء میں سنٹرل نیوز آرگنائزیشن وزارت اطلاعات ونشریات سے ہوا جب آپ نے ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی نیوز ترجمہ کر کے اس کو براڈ کاسٹ کرنا شروع کیا، 5 سال تک ایڈیٹر "اولس" رہے۔ پی سی ایس کرنے کے بعد اسسٹنٹ کمشنر بنے۔ بعد میں آپ ڈپٹی کمشنر خضدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جس کے بعد آپ ڈپٹی سکریٹری ہیلتھ (D.S Health) کے عہدے تک پہنچ گئے اور 1984ء میں آپ ڈائریکٹر لوکل

[1] حکیم بلوچ دوسرا انٹرویو۔ سوموار 22-10-2010 بمقام مشرق دفتر دن 1 بجے

گورنمنٹ (Director LG) رہے۔1985ء میں ڈپٹی کمشنر لورالائی بنے۔1987ء میں آپ نے ڈائریکٹر جنرل بلوچستان انٹی گریٹڈ ایریا ڈیولپمنٹ (Director General BIAD) کی خدمات سرانجام دیں اور بعد میں آپ کوئٹہ، سبی اور ژوب ڈویژن میں کمشنر بھی رہے 1991ء میں آپ بطور سکریٹری سروس اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (Secretary S&GAD) کی خدمات سرانجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ سکریٹری ہوم اور ٹرائبل افئیرز (Secretary Home & Tribel Affairs) اور سکریٹری تعلیم بھی رہے۔ اس کے بعد آپ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف بلوچستان کے عہدے پر فائز ہوئے اور بالآخر 24 دسمبر 2002ء میں 21 گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔

ممبرشپ:

حکیم بلوچ مختلف شعبوں میں ممبر بھی رہے آپ 1992ء میں ممبر بورڈ آف ریونیو لینڈ یوٹی لائزیشن (LU) رہنے کے علاوہ 2003ء سے بلوچستان بار کونسل اور بلوچستان ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ممبر رہ چکے ہیں آپ 1961 سے لیکر 1973ء تک بلوچی اکیڈمی کے گورننگ باڈی کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔

تنظیموں کی صدارت:

حکیم بلوچ نے دو بڑی طلباء تنظیموں کی صدارت بھی کی ہے۔ آپ نے نوجوانوں کو ان کے اصل مقاصد سے آگاہ کرنے اور ان کی فکری جہت کو صحیح سمت دینے کے لئے 1962ء سے 1963ء تک کوئٹہ میں ورنا وانندہ گل (بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن) کے بانی صدر رہے۔ اور اسی فکر کے تناظر میں کراچی میں بھی بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے 1965ء سے لیکر 1966ء تک صدر بھی رہے۔

بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی:

حکیم بلوچ نے درج ذیل وفود میں بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔

1۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (I.L.O) ٹورین اٹلی اگست 1990ء۔

2۔ ورلڈ ٹوورزم آرگنائزیشن (W.T.O) قاہرہ مصر اکتوبر 1995ء۔

3۔ انٹرنیشنل ٹوورزم (I.T.B) برلین جرمنی مارچ 1996ء۔

4۔ ساؤتھ ایشیاء فری میڈیا ایسوسی ایشن (SAFMA) ڈھاکہ بنگلہ دیش مئی 2003ء۔

5۔ ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن (SAFMA) اسلام آباد پاکستان جون 2004ء۔

6۔ سارک (SARC) رائیٹرز (Writers) کانفرنس لاہور پاکستان 2004ء۔

مختلف ممالک کے دورے:

عبدالحکیم بلوچ نے اب تک دنیا کے بیس سے زائد ممالک کے دورے بھی کیئے ہیں۔ جن میں سرفہرست ممالک درج ذیل ہیں۔

افغانستان، ایران، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، ملیشیاء، سنگاپور، تائیلینڈ، متحدہ عرب امارات، بحرین، کویت، سعودی عرب، مصر، ترکی، یونان، اٹلی، جرمنی، فرانس، یونائیٹڈ کنگڈم اور متحدہ ریاست ہائے امریکہ شامل ہیں[1]۔

زبان وتصانیف:

حکیم بلوچ کو بلوچی، فارسی، اُردو اور انگلش پر خوب دسترس حاصل ہے۔ ان زبانوں میں بلوچی آپ کی مادری زبان ہے۔ حکیم بلوچ نے بلوچی، انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ آپ کی ان تصانیف میں، آس ءِ چہر، سنگ گران، کندیت، ماتم دانش، شبیہہ شاد، زیرِ سایہ خورشید، بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت، عوامی دکھ کا سفر، دروش جتیں ارواح، کوبراز ووٹ اوکس (Cobra's votive Kiss) سلورفوٹڈ ڈان (Silver Footed Dawn) ٹیر زآف ریسریکشن (Tears of Resurrection) گجین آزمانک اور خواب پیام پیان شامل ہیں۔

---

[1] کوائف حکیم بلوچ مسودہ ص ۴-۵

غیر مطبوعہ تصانیف:

حکیم بلوچ کی تصانیف میں اردو تصنیف خواب پیام پیان اور انگریزی تصنیف سلور فوٹڈ ڈان (Silver Footed Dawn) ابھی تک غیر مطبوعہ شکل میں ہیں ہے[1]

تعارف تصانیف

اردو تصانیف

شبیہہ شاد

شبیہہ شاد عطا شاد کی شخصیت اور فن کی مکمل شرح ہے۔عطا شاد حکیم بلوچ کے بچپن کے ساتھی تھے عہد شباب میں بھی وفا نبھاتے رہے۔جب عطا دارِ فانی سے اوجھل ہوئے تو حکیم بلوچ عطا شاد کو اس کی شاعری میں تلاش کرنے نکلے اور اس تلاش دوست میں آپ کامیاب بھی ہوئے اور آپ نے عطا کی شبیہہ کو جس طرح پایا اسے ''شبیہہ شاد'' کے عنوان سے کتابی صورت میں قلم بند کیا، جو کہ حکیم بلوچ کی طرف سے عطا کی روح کے لئے ایصال طمانت اور سکون کا باعث ہے۔حکیم بلوچ نے درج ذیل عطا شاد کی کل 16 منظومات کے آئینے میں عطا شاد کے فن اور شخصیت کا تجزیہ کیا ہے۔

ا۔سنگِ آب ۲۔فراق کا کرب ۳۔سہتکیں دل ءِ زہیر ۴۔بہا بدن ۵۔دل گریت و شب نا ریت ۶۔جنوزان ۷۔پھلانی خشکیں پن ۸۔روشنی کا گوہر ۹۔عہد حاضر کا دشمن ۱۰۔نفاق و برادر کشی ۱۱۔دل کا غم ذدہ بولان ۱۲۔پھول اور پریاں ۱۳۔رد چ درفشگا انت ۱۵۔ایک اور سورج جلا ۱۶۔وفاء دنیا۔

شبیہہ شاد میں حکیم بلوچ نے ایک طرف تو عطا شاد کی رومانوی و مزاحمتی شاعری کو بلوچی کلاسیکی شاعری سے جوڑ کر معتبر بنا دیا ہے تو دوسری طرف آپ نے عطا شاد کی شاعری سے سیاسی آزادی اور انصاف کے صحیح فہم کو اجاگر کرنے اور تاریخ نویسی میں کمال دکھایا ہے۔اس کتاب کو دو مرتبہ شائع کیا گیا ہے۔پہلی مرتبہ اس کتاب کو 1999ء میں ''پاکستانی ادب کراچی'' نے شائع کیا اور دوسری مرتبہ یہ 2003ء میں قلات پبلشر کوئٹہ کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔

---

[1] اب یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ماتم دانش

یہ کتاب ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں حکیم بلوچ ہر مضمون میں ظلم و استبداد ، آمریت اور ناانصافی کے علاوہ کرپشن اور نااہلی کے خلاف ادیب و دانشوروں کی قلبی اور قلمی آوازوں کو متحرک کرنے کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین جنگ اور مشرق کے ادبی صفحوں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں حکیم بلوچ کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں حکیم بلوچ جہاں قرآنی آیات سے فہم الاداب کے ہیرے ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے ہیں وہاں وہ فکر و اصلاح کی دعوت دیتے ہوئے ادیبوں اور دانشوروں کے کردار پر سر دھنتا ہوا بھی نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کو پہلی بار 2001ء میں ''پاکستانی ادب کراچی'' نے شائع کیا اور دوسری مرتبہ یہ ''بلوچیہ لوزانک کوئٹہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے''۔

زیرِ سایہ خورشید

یہ کتاب بلوچستان کی قبائلی وسرداری سیاست، ملکی مسائل، سیاسی، عمرانی اور تہذیب وثقافت کے موضوعات پر تاریخ کے آئینے میں سیر حاصل بحث ہے جس سے بلوچستان کے تاریخی اور سیاسی مسائل اور ان کے حل کا ادراک پیدا ہوتا ہے۔ زیرِ سایہ خورشید 2004ء میں ''انتخاب پبلیکیشن'' کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت

یہ کتاب بہترین تاریخی اور تحقیقی تجزیہ ہے اس کتاب میں حکیم بلوچ نے بنیادی طور پر چار قوتوں کا تقابلی جائزہ لیا ہے ایک طرف مرکزی حکومت، دوسری طرف خان، تیسری طرف سردار اور چوتھی طرف قلات کے خان آخر احمد یار خان کے کرداروں کا بہترین انداز میں تجزیہ کر کے آپ نے تاریخ نویسی کے فن میں کمال دکھایا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کے بعد آپ عوم الناس پر فیصلہ چھوڑتے ہیں کہ وہ انصاف کو کس معیار پر رکھتے ہیں۔

یہ کتاب 2007ء میں مارکیٹ میں آئی جسے " گوشہ ادب کوئٹہ " نے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جمہوری پبلی کیشنز لاہور نے 2010 میں شائع کیا ہے۔

خواب پیام پیان

یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے انشاء اللہ بہت جلد، منظر عام پر آنے والی ہے۔ یہ کتاب اردو افسانوی مجموعہ ہے جو حکیم بلوچ کی افسانہ نگاری کی بہترین کاوش ہے۔[1]

عوامی دکھ کا سفر

یہ کتاب بلوچستان کے سلگتے مسائل اور علاقائی و بین الاقوامی حالات پر سیاسی اور تاریخی تجزیہ ہے جو بہترین تخلیقی محاسن سے مزین ہے اس کتاب کے کالمز اگست 2001ء سے لیکر 2006ء تک مختلف اخبارات میں چھپتے رہے 2008ء میں حکیم بلوچ کے اس فگار نگاریوں کے مجموعے کو سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ نے شائع کیا۔

انگلش تصانیف

کوبراز ووٹیو کس (Cobra's votive Kiss)

یہ کتاب حکیم بلوچ کی انگریزی افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں اپنی مٹی کی خوشبو، روایات اور تہذیب و ثقافت کو افسانوی تکنیک اور منفرد اسلوب کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس افسانوی مجموعے کے مطالعہ سے حکیم بلوچ ایک جدت پسند مگر اپنی روایات سے جڑی ہوئی نتیجہ خیز ترقی کی خواہش مند نظر آتے ہیں۔[2]

---

[1] یہ کتاب چھپ کر اب مارکیٹ میں آ گئی ہے۔

[2] اس کتاب کو یو۔ بی۔ ایل۔ جنگ گروپ نے انگریزی نثر و افسانہ کی بہترین کتاب کا ایوارڈ 2010 کا اعزاز نواز کر مصنف کو تین لاکھ روپے کا انعام بھی دیا ہے۔

ٹئیرز آف ریسر کشن(Tears of Resurrection)

یہ کتاب حکیم بلوچ کے افسانوی اورادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے باب میں آپ نے بلوچی کلاسیکی شاعری کو سماجی اور ثقافتی خدوخال میں پیش کیا ہے دوسرے باب میں تحقیقی مقالات تیسرے باب میں ذکر رفتگاں ہے جن کو خصوصی طور پرخراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں حکیم بلوچ نے حالات حاضرہ کا تجزیہ کیا ہے اور آخری باب میں سات افسانے شامل ہیں جو سماجی، سیاسی، ثقافتی اور انصاف کے موضوعات پر ہیں۔

اس کتاب کو 2000ء میں بلوچی اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

سلورفوٹڈ ڈان(Silver Footed Dawn)

یہ کتاب بھی حکیم بلوچ کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے مگر یہ کتاب بھی ابھی غیر مطبوعہ شکل میں ہے اور انشاءاللہ جلد مارکیٹ میں آنے والی ہے۔[1]

بلوچی تصانیف

کاندیت

"کاندیت" ایک فرانسیسی تصنیف (Candide) کا بلوچی ترجمہ ہے جسے فرانسیسی کلاسیکل ناول نگار "والٹیر" نے 1759ء میں تحریر کیا ہے۔اس کتاب کا پیش لفظ معروف ادیب ودانشور جناب امان اللہ گچکی نے تحریر کیا ہے۔

والٹیر اپنے زمانے میں علم اور منطق وفلسفہ میں بہت ماہر شخصیت تھے اور انہوں نے اپنی اس کتاب (Candide) کو اس دور میں یورپ کی جہالت، تنگ نظری، آمروں اور ان کے وزیروں کی ظلم وزیادتی غریبوں اور بے بسوں کی لاچاری سے جنم پانے والے ایک غیر مستحکم معاشرے کے پس منظر میں لکھا ہے۔والٹیر کی اس کتاب کا ترجمہ حکیم بلوچ کا ادب میں ایک گران بہا تحفہ ہے جسے بلوچی اکیڈمی

---

[1] اب یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔

گچین آزمانک

یہ کتاب حکیم بلوچ کا بہترین افسانوی مجموعہ ہے جس میں مختلف ترقی یافتہ زبانوں کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کو ایم۔اے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ گچین آزمانک کو 1970ء میں بلوچی اکیڈمی نے پہلی بار شائع کیا ہے۔ اور 2010 میں اس کو دوبارہ چھاپا ہے۔

دورش جتیں ارواح

یہ کتاب حکیم بلوچ کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے اس کتاب کے افسانے حکیم بلوچ کی طبیعت، فکر، تہذیب وثقافت اور زمینی حقائق سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کو 2008ء میں بلوچیہ لوزانک پبلی کیشنز کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔

آس ءِ چہر

یہ کتاب حکیم بلوچ کے افسانوں اور ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں شامل افسانوں میں کچھ افسانے آپ نے اس وقت لکھے تھے جب آپ نے سرکاری ملازمت میں ابھی نئے نئے ہی خدمات سرانجام دینی شروع کی تھی اور یہ دور 60ء کی دہائی کا دور تھا یہ کتاب ڈراموں اور افسانوں کی یکجا صورت میں 2000ء میں منظر عام پر آئی جسے بلوچی اکیڈمی نے شائع کیا۔

سنگ گراں

''سنگ گراں'' حکیم بلوچ کی ادبی تنقید کے مضامین کا مجموعہ ہے اس میں تنقیدی اسلوب پر بھی مضامین شامل ہیں۔ جس کی مثال اس سے پہلے بلوچی ادب میں نہیں ملتی ہے اگر ملتی ہو تو ایک خفیف نشان کی صورت میں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب نے تنقیدی اسالیب کو مغربی مفکروں ونقادوں کی طرز پر پہلی دفعہ بلوچی میں متعارف کرایا۔

بلوچ صاحب نے عہدی اور کلاسیکی ادب کے علاوہ بلوچی عوامی ادب و شاعری کو ایک نئے اسلوب میں بہترین شرح و تعبیر اور تبصروں سے استوار کر دیا ہے۔ اور اس کتاب میں آپ نے بلوچی ادب کو عالمی تناظر میں جدید عالمی دانشورانہ انداز میں اس طرح متعارف کروایا ہے کہ جس سے بلوچی ادب دنیا کی دیگر ترقی یافتہ ادبیات کے شانہ بشانہ کھڑا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

سنگ گراں کو 2001ء میں بلوچی اکیڈمی نے شائع کیا ہے[1]

شخصیت اور فن

حکیم بلوچ ایک منفرد ادیب، دانشور، مفکر، تجزیہ نگار اور بیوروکریٹ ہیں۔ عموماً مشاہدے سے یہ سامنے آیا ہے ایک ایسا بیوروکریٹ جو ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہو تو وہ اپنے عہدے کے اسم صفت کے حوالے سے زیادہ اور ایک انسان کے حوالے سے بہت کم پہچانا جاتا ہے۔ لیکن حکیم بلوچ کے ساتھ یہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ آپ کی شخصیت پر ایک بیوروکریٹ کے مزاج سے زیادہ ایک ادیب کا مزاج غالب ہے۔ اور ایک غالب الادب مزاج شخص ہی انسانیت کے معیار پر پورا پورا اتر سکتا ہے کیونکہ ادب کا موضوع ہی ''انسان'' ہے اور ادب کا ایک پیروکار ہی انسان کی عظمت کا بہتر ادراک رکھتا ہے۔

حکیم بلوچ انسان کو محض انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں آپ انسان کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کے خلاف ہیں حالانکہ آپ کو نفسیات شناسی کے فن میں بہت مہارت حاصل ہے۔ آپ کسی شخص کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی پہچان لیتے ہیں کہ وہ شخص کون ہے، کس معاشرے سے اس کا تعلق ہے، سماج میں اس کا کیا مقام ہے، اس کی سوچ کیا ہے اور کس ذہنیت کا حامل انسان ہے۔ مگر یہ سب جاننے کے باوجود آپ سب کے ساتھ خوش اسلوبی اور میانہ روی سے پیش آتے ہیں۔ آپ کسی بھی انسان کو اپنی برتری کا احساس نہیں ہونے دیتے اور یہی وہ خوبی ہے جس نے آپ کو مقامِ ارفع تک پہنچایا ہے آپ ایک میانہ رو انسان ہیں نہ انتہائی بلند آواز میں قہقہہ لگاتے ہیں۔ اور نہ زیادہ سنجیدہ رہتے ہیں۔ بس ایک ہلکی سی

---

[1] درج بالا تصانیف کے پبلشرز اور سال اشاعت انہی کتابوں کے معرفتی صفحات سے اخذ کئے گئے ہیں۔

مسکراہٹ سے سامنے والے کا دل جیت لیتے ہیں۔آپ میں اپنی بات سنانے سے زیادہ دوسروں کی بات سننے کا رجحان پایا جاتا ہے۔آپ ایک ہلکی سی جنبش سے سر ہلاتے ہوئے متکلم کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور سمجھی جا رہی ہے۔اختتام کلام پر جب آپ متکلم کے مؤقف کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو انتہائی نرم گفتاری اور لہجے کی برجستگی کا خیال رکھتے ہوئے منطقی بنیادوں پر ایک ایسا منفرد علمی اسلوب استدلال سے وہ حکیمانہ گفتگو کرتے ہیں جس سے سامنے بیٹھا شخص انگشت بدنداں ہو کر دل ہی دل آپ کی علمی اور فکری انفرادیت اور برتری کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔جیسا کہ پروفیسر سلطان محمود نیازی حکیم بلوچ کی کتاب "شبیہہ شاد میں" حکیم بلوچ منفرد دانشور و مفکر ادیب" کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" حکیم بلوچ دیکھنے میں ایک سادہ منش اور عام شخص دکھائی دیتا ہے
جس کا ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا انداز اور اپنا مؤقف بیان کرنے کی بجائے دوسروں کی
باتیں غور سے سننے کا میلان ابتداء میں کوئی گہرا تاثر پیدا نہیں ہونے دیتا لیکن
گونا گوں خواص کا حامل یہ مرد حق پرست جب اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر
کرنے پر آتا ہے تو تہہ در تہہ فکر و تدبر کے ایسے خزینے دریافت ہونے لگتے ہیں
کہ دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں اور ادبی بالغ
نظری کا احساس بتدریج پھیلتا چلا جاتا ہے اور پھر اس قسم کا تاثر گہرے سے گہرا
ہوتا ہوا دوسروں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے جس طرح حسن بے پروا کو
اپنے حسن کا ادراک نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح عبدالحکیم اپنی وسعت نظر اور
دائرہ کمال سے آگاہ معلوم نہیں ہوتا اور اس حقیقت سے بیگانہ لگتا ہے کہ
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں
وہ اس کم مائیگی کے تاثر کو ساتھ لیے ایک نو آموز کی طرح ساحل پر

---

[1] شبیہہ شاد حکیم بلوچ اشاعت دوئم ص ۱۳۸

سنگریزوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ
بھرپور موجوں نے چاروں طرف سے اسے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔[1]"

حکیم بلوچ کی ادبی مزاج شخصیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنا بچپن عطا شاد کے ساتھ گزارا، حکیم بلوچ کی کتاب "شبیہ شاد" کے مطالعے سے کبھی عطا شاد کے شعروں سے حکیم بلوچ کا مزاج اور کبھی حکیم بلوچ کی تحریر سے عطا شاد کے مزاج کا رنگ جھلکتا ہے۔ دونوں شخصیات کی مزاجی اختلاط و یک رنگی سے دونوں ایک ہی چراغِ ادب کے پرتو اور ایک ہی پھول کے بھنورے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی یک شبیہی مزاج دوستی کے تناظر میں حکیم بلوچ اپنی کتاب "شبیہہ شاد" میں "تلاشِ دوست" کے عنوان سے کہتے ہیں۔

"میری اور عطا کی دوستی اسکول کے زمانے میں شروع ہوئی، کالج کے دنوں میں پروان چڑھی غم روزگار کے دنوں پکی ہوئی۔ عطا شاد نے دو سال پہلے جب اچانک "راہ ابد" پر سفر شروع کیا تو رشتوں میں ایک گونہ قطع مراسم کا جانکاحساس ضرور ہوا۔ مگر دوستی کے ابدی رشتے اب تک برقرار ہیں۔۔۔۔ میں جب اپنے دردمند دل کے آئینے میں جھانکتا ہوں تو عطا کو اپنے پاس محسوس کررہا ہوتا ہوں"۔[1]

حکیم بلوچ کی ہمہ ساعت فروغ ادب کاوشوں اور معیت عطا شاد انتخاب راہ ادب نے نہ صرف آپ کی شخصیت کی لڑی میں شائستگی و رعنائی کے ہیرے پرو دیئے بلکہ آپ کے مزاج کو بھی ادبی حامل شائستگی اور خود اطواری بخشی۔

حکیم بلوچ بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ آپ افسانہ نگاری، تجزیہ نگاری اور تحقیق و تنقید کے بادشاہ ہیں۔ آپ کی نثر نگاری میں بہترین تشبیہات و استعارات اور بہترین الفاظ کا برمحل استعمال ملتا ہے۔ حکیم بلوچ کی نثر نگاری میں شاعرانہ انداز بیان ملتا ہے۔ اس ضمن میں سلطان محمود نیازی "حکیم

[1] شبیہہ شاد حکیم بلوچ اشاعت دوئم ص ۱۳۔۱۵

بلوچ" منفرد دانشور و مفکر ادیب" کے عنوان سے کہتے ہیں۔

"حکیم بلوچ کی حسن جمالی میں Aesthetic Sense اس کی نگارشات میں جابجا ابھر کر سامنے آتی ہے وہ خود تو شاعر ہونے کا دعویدار نہیں لیکن اس کا شاعرانہ تخلیل اس قدر حاوی ہے کہ وہ اپنی نثر میں شاعری کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[1]

حکیم بلوچ کی نگارشات میں جس طرح ان کے شاعرانہ تخیلات کا ادارک ہوتا ہے اس کی مثال درجہ ذیل اقتباس سے ملتی ہے۔

"تخلیقی عمل۔۔۔نے سرد پتھروں کو پگھلنے کے عمل سے دوچار کیا ہے یا ٹھہرتی شبوں کے اندھیروں کو تابنا کی ءخورشید سے منور کر دیا ہے یا شاعر کا وہ کشف جس نے ساری حجابات کو ہٹا دیا اور یوں کرب ذات کو کرب تخلیق سے ہمکنار کر کے فن کو سرچشمہ حیات کے آب حیوان سے سیرابی کا یارا بخشا ہے"۔[2]

حکیم بلوچ کی تنقید نگاری میں جذیات نگاری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔آپ معمولی سے معمولی نکتے کو عمیق نظری سے پرکھتے ہیں اور اس نکتے سے دیگر کئی نکتے علیحدہ کر کے ہر ایک کا جدا جدا تجزیہ کرنے کے بعد اہم نکتے کو زیر بحث لاتے ہیں جس سے حقیقت خود بخود اپنے چہرے سے پردہ ہٹانے سے مجبور ہوتی ہوئی آشکارہ ہو جاتی ہے۔حکیم بلوچ کے افسانوں میں فنی چابکدستی ہوتی ہے پلاٹ میں ہر واقعہ دوسرے واقع سے منطقی جواز کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔جس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت کا احساس نہیں ہوتا مرقعہ نگاری اپنی مثال آپ ہے۔ ہر کردار اپنا تعارف خود کرتا ہوا نظر آتا ہے۔منظر نگاری بہترین اور محل و مقام کی مناسبت سے تشکیل دی گئی ہوتی ہے تشبیہات اور استعارات زود فہم ہوتے ہیں۔آپ کے افسانوں میں بیانیہ انداز تحریر زیادہ غالب ہے۔زبان و بیان میں خالص پن اور وزن دار محاوروں کا استعمال ہوتا ہے جو ترقی یافتہ ادبیات سے لیے گئے ہوتے ہیں۔

۱۔روزنامہ جنگ ۱۴ اگست ۲۰۰۱ء صفحہ فکر و ادب

۲۔شبیہہ شاد حکیم بلوچ اشاعت دوئم ص ۲۱

حکیم بلوچ کی کالم نگاری میں بین الاقوامی، ملکی اور علاقائی سیاست پر تبصرے، تاریخ نویسی اور ادبی موضوعات بہترین تخلیقی محاسن کے ساتھ ملتے ہیں۔

ادبی سفر کا آغاز

حکیم بلوچ نے 19 برس کی عمر میں ادبی سفر کا آغاز کیا اسکول کے زمانے میں عطا شاد، صدیق آزاد، نعمت اللہ گچکی اور حکیم بلوچ نے اپنے استاد اور نامور شاعر و ادیب جناب عبدالواسع حزین لکھنوی کی سرپرستی میں ایک بزم ادب کا انعقاد کیا۔ اس بزم ادب کے تخلیقی پروگرام نے حکیم بلوچ کے تخیل کو ادبی سمت دی اور آپ نے اسی دن سے ادبی سفر کا آغاز کیا اس کے علاوہ اردو اور انگریزی مباحثوں میں شرکت کا آغاز انہوں نے اپنے استاد اور ہیڈ ماسٹر جناب عبدالاحد خان کی زیر نگرانی انگریزی زبان و ادب اور گرائمر کو پوری طرح میٹرک ہی میں سیکھ لیا تھا۔ حافظ سعدی، غالب اور اقبال کو اسکول ہی کے زمانے میں پڑھا کالج میں پروفیسر کرار حسین سے اپنی ادبی بنیادوں کو مضبوط کیا[1]۔ جس کے بعد سب سے پہلے آپ نے جس رسالے میں لکھا وہ بلوچی ماہ نامہ ''اولس ہے''۔ جس میں 1961ء میں آپ نے لکھنا شروع کیا۔ اور مارچ 1967ء سے اکتوبر 1972ء تک ''اولس'' کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کے مضامین ''اولس'' میں 1986ء تک چھپتے رہے اور بعد میں اس ماہ نامے کے بند ہونے پر بلوچی رسالوں میں اپنی تحریریں چھپواتے رہے۔

1950ء سے لیکر 1960ء کی دہائی بلوچی ادب کا تحریری دور کہلاتا ہے اس دور میں عطا شاد، صدیق آزاد، میر گل خان، نصیر میر مٹھا خان مری، ملک محمد پناہ، سردار خان گشکوری، کریم دشتی، عنقا اور امان اللہ گچکی نے زبان و ادب کی ترقی کے لئے جو خدمات انجام دیں ان میں سے حکیم بلوچ کا نام بھی ان صفِ اول کے ادباء کی فہرست میں شامل ہے۔ حکیم بلوچ نے سب سے پہلے انگریزی ادب کی اضاف کا ترجمہ بلوچی میں کیا تا کہ اس خطے کے لوگوں میں ادب کی مختلف اصناف کی رموز و اوقاف کا ادراک پیدا ہو۔ حکیم بلوچ کی ارتقائی ادبی خدمات کے تناظر میں ڈاکٹر علی دوست بلوچ اپنی کتاب

---

[1]۔ جنگ مڈ ویک میگزین ۱۴ فروری ۲۰۰۱ء

"بلوچی دیوان" میں حکیم بلوچ کا علمی اورادبی سفر کے عنوان سے کہتے ہیں۔

" حکیم بلوچ خود بھی "اولس" بلوچی کے مدیر رہے ہیں معروف دانشور امان اللہ گچکی اور ان کے اپنے دور میں "اولس" میں معیاری تخلیقات شائع ہوئیں ہیں۔ اس وقت کے دیگر لکھنے والوں میں کئی نام ایسے ہیں جنہیں زبان وادب کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ان میں سردار خان گشکوری، خدا بخش مری، کریم دشتی، آزات جمالدینی، عنقاء، میر گل خان نصیر، سید ہاشمی، میر مٹھا خان مری، ملک محمد پناہ، امان اللہ گچکی، عطا شاد، صدیق آزات، بشیر احمد بلوچ، غوث بخش صابر، عبداللہ جان جمالدینی، صورت خان مری، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔ جنہوں نے تخلیق اور تحقیق کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔" [1]

حکیم بلوچ کی ادب کے لئے ہر کاوش نقش اول کی حیثیت کا حامل ہے۔ آپ نے جہاں مغربی اصناف کے ترجمے کے ذریعے اس خطے میں فنی وفکری آگاہی کی ابتداء کی وہاں آپ وہ پہلی شخصیت بھی ہیں جس نے بلوچی، اردو اور انگریزی میں افسانے لکھ کر صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر فکشن نویسی کے ایک نئے اور منفرد اسلوب کو ایک نئے رجحان کے ساتھ منصۂ شہود پر لایا۔ حکیم بلوچ نے 1967ء سے 1973ء تک ریڈیو پاکستان میں بلوچی ڈراموں کے لئے گران قدر خدمات سرانجام دیں۔ اور پھر آپ نے اپنے تمام ریڈیو ڈراموں کو یکجا کر کے انہیں مطبوعہ شکل دی۔ جس سے ڈرامہ نگاری کے فنی اسلوب فہمی میں سہل پیدا ہوئی۔ اسی طرح حکیم بلوچ، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے بانی ممبروں میں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اخباروں اور رسالوں میں ادبی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی امور پر ایسے نکتے اٹھائے ہیں جس پر پہلے کسی قلم کار نے غور نہیں کیا تھا "عوامی دکھ کا سفر"، "بلوچ قومیت، خانیت اور سرداریت" اور "زیرِ سایہ خورشید" اس کی بہترین مثالیں ہیں یہ وہ کتابیں ہیں جن میں آپ کے بہترین

[1]۔ بلوچی دیوان ڈاکٹر علی دوست بلوچ ۳۰۸

سیاسی وتاریخی تجزیے وتبصرے اور صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل کا حل ادبی طرز نگارش کے ساتھا موجود ہے۔اس کے علاوہ موجودہ زمانے میں آپ نے ایک ماہ نامہ "بلوچیہ" کا بھی اجراء کیا ہے جو بہ یک وقت بلوچی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ادبی، تاریخی اور سیاسی مضامین پر مشتمل ہے۔

حکیم بلوچ کے ادبی سفر نے ارتقائی منازل کو طے کرتا ہوا اب ادب کو جس رفعت و بلندی تک پہنچا دیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ انہی گران قدر خدمات کے پیشِ نظر **2009**ء میں حکومت بلوچستان نے آپ کو "مست توکلی ایکسیلینس (Excellence) ایوارڈ سے نوازا۔ جبکہ حکومت پاکستان نے آپ کو **2010** میں تمغہ امتیاز کا ایوارڈ دیا۔[1]

[1]۔ کوائف حکیم بلوچ (مسودہ) ص ۴۔۵

باب دوئم

حکیم بلوچ اور فکر و ادب

حکیم بلوچ کی فکشن نویسی

اگر صحیح معنوں میں غور کیا جائے تو ادب وہ معلم ہے جو مستند تاریخ اور مدلل و فلسفیانہ انداز بیان سے بھی زیادہ حقائق کا ادراک پیدا کرتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی سے تو زندگی گزارنی سہل ہوگئی ہے مگر فکر و اصلاح کے میدان میں ہمارا سماج شبیہہ حیوان اختیار کرتا جارہا ہے۔ ہر جگہ رنگی و نسلی، علاقائی و لسانی، مذہبی و ملکی، گروہی اور قبائلی تعصبات معاشرتی رجحان کی صورت اختیار کر کے انتشار کا باعث بن رہے ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہے اس جہت کے نظر انداز کرنے کا جسے "ادب" کہتے ہیں۔ جنگ حلقہ ادب کوئٹہ کی جانب سے منعقد کردہ ایک تنقیدی نشست سے حکیم بلوچ نے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

> "ادب انسان کو انسان بناتا ہے ادب ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے فکری انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ ادب کسی بھی زبان میں لکھا جائے وہ ہمارے لئے قابل احترام ہے میں انہیں اپنے ملک کا گراں قدر سرمایہ سمجھتا ہوں ہر زبان کے لکھنے والے ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔"[1]

ادب میں افسانہ وہ صنف ہے جو حقائق کو معاشرے کے سامنے اس طرح آویزاں کرتا ہے جیسے کسی لطیف تجریدی شاہ پارہ کو تجسیمی تصور میں بدل دیا جائے۔ افسانہ اپنے تئیں تریاق کی سی تاثیر لیے فکر

---

[1] جنگ مڈ ویک میگزین ۲۷ ستمبر ۲۰۰۰ رپورٹ اختر سعیدی جہان ادب صفحہ روزنامہ جنگ کراچی

وشعور کے نشے کو یوں مخمور کر دیتا ہے کہ انسانی سوچ جو اس کے تخلیقی وجدان کے راز کو منصور حلاج کی طرح چار سو مشتہر کر دیتا ہے زاویے بدل جاتے ہیں اور اصلاح وتنوع کا مثبت رویہ انسانی ذہن کو ایک خاص آئیڈیل کی تلاش میں مصروف عمل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانے کا تخلیقی اور انقلابی صنف ادب کا ہونا ایک مسلم امر ہے مگر حکیم بلوچ نے اس خطے میں افسانہ نگاری کو ایک نئے اسلوب اور ایک نئے رجحان کے ساتھ متعارف کروایا۔ جس سے حکیم بلوچ کے افسانوں میں اثر ڈالنے کی قوت دو چند نظر آتی ہے جیسے کہ ڈاکٹر علی دوست بلوچ کہتے ہیں۔

> "ابتداء سے لیکر آج تک بلوچی افسانے نے اپنے موضوعاتی رنگارنگی کے ساتھ تکنیکی اور فنی لحاظ سے بھی بڑی ترقی کی ہے ہمارے ہاں اس وقت تک شاید چیخوف، ٹیگور اور موسپاں جیسا افسانہ نگار پیدا نہیں ہوا لیکن ہمارا افسانہ نگار ہمسایہ زبانوں کے افسانوں نگاروں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں اور حکیم جان کے افسانے اس کی بہترین مثالیں ہیں" ۱؎

حکیم بلوچ کے افسانے ان کی اپنی سرزمین کی تہذیب وثقافت، تاریخ، حکمرانوں کے ظلم واستبداد اور ان کی غلط پالیسیوں کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں، طبقاتی نظام زندگی، موجودہ قبائلی نظام سے ابھرنے والے منفی رجحانات اور اکیسویں صدی کے تقاضوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا موضوع جو کچھ بھی ہو مگر ان کے گہرے مطالعے سے وطن عزیز کی خوشبو، عمدگی، پاکیزگی کا عکس جھلکتا ہوا ضرور نظر آتا ہے۔ حکیم بلوچ کے افسانوں میں حقیقت نگاری کو اولین ترجیح حاصل ہے وہ اپنے افسانوں میں معاشرتی زوال کی وجوہات کو برآمد کرتے ہوئے ایک حقیقت نگار کے روپ میں سامنے آتے ہیں آپ کے افسانوں میں آپ کا لہجہ دوٹوک اور نفاق سے عاری نظر آتا ہے۔ آپ کی حقیقت نگاری کے تناظر میں مجاہد بریلوی کہتے ہیں۔

"حکیم بلوچ کی کہانیوں میں بلوچ معاشرتی اور تہذیبی خدوخال کو حقیقت

۱؎ روزنامہ جنگ ۹ دسمبر ۲۰۰۷ء

پسندی سے یوں برتا گیا ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر بھی کل کا جذ لاینفک نظر آتا ہے"۔[1]

حکیم بلوچ کی حقیقت نگاری استحصالی نظام کے خلاف ایک آواز ہے۔آپ اپنے افسانوں میں حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے آپ بھی افسانے کے کرداروں میں ایک کردار ہیں اور جہاں آپ نے ظلم و بربریت کی چکی میں لوگوں کو پستے ہوئے دیکھا وہاں آپ نے حقائق کو بہترین مرقعے میں پیش کیا۔اس کی مثال ہمیں "یرغمال لاشہ میں یوں ملتی ہے۔

"کس نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ فیض صاحب نے چپ سادھ لی تھی آپ کو فیض صاحب کی وہ نظم جوانہوں نے لندن میں کہی تھی ضرور یاد ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"ہاں وہ نظم مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ نظم بھی بہت اچھی تھی جو مجھے ایک دوست نے لکھ کر دی تھی اور مجھ سے کہا تھا میرے دوست عطا شاد سے کہو ایسی نظمیں لکھا کرو لیکن ہمارے قومی شاعر بھی علامہ اقبال کی طرح کی قومی فکر رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اب آجو خود آ پہنچے اور ہم سے دعا سلام کیا مجھ سے بغل گیر ہوئے پوچھا میں کب آیا ہوں میں نے ان کو بتایا ائیر پورٹ سے سیدھا آرہا ہوں تا کہ اپنے پرانے ساتھی کا آخری دیدار کرسکوں یہ سن کر وہ آبدیدہ ہو گئے۔کافی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے ان کی آواز جیسے گلے میں اٹک گئی تھی۔روہانسی آواز میں کہنے لگے۔

"میر چاکر میں کیا بتاؤں آپ کو صد آفرین کے اتنی دوار سے اپنے دوست کا آخری دیدار کرنے آگئے جو ہم سب کو چھوڑ چکا مگر اس کے اقربا کسی کو دیدار کرنے نہیں دے رہے ہیں۔ہمارا خیال تھا میر غوثی آئیں گے تو ان کو دیدار کرانے پر آمادہ کر لیں گے۔شومئی قسمت کہ مارشل لاء حکام نے ان کو اجازت نہ دی"۔[2]

---

[1] کتاب رسالہ مئی تا ستمبر ۲۰۰۹ء

[2] "یرغمال لاشہ" ماہنامہ بلوچیہ کوئٹہ ص ۸ جولائی ۲۰۰۵

حکیم بلوچ نے اس افسانے میں عسکری بادشاہت کے تحت ظلم و استبداد کے زیرِ اثر پید اہونے والے سماجی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کو اجاگر کرتے ہوئے آمرانہ نظامِ حکومت کے جو بھی مفاسد ہو سکتے ہیں ان سب کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ کہ آمریت میں ریاست کے پورے ڈھانچے پر ایک فرد واحد کا قبضہ ہوتا ہے اور اس ریاست میں قانون (L a w)اور آئین (Constitution) محض آمر کی ذاتی خواہشات کا نام ہوتا ہے۔ حتیٰ کے شادی اور فوتگی اور دیگر رسومات کی ادائیگی میں بھی عوام خود مختار نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں آواز اُٹھانے والے ادیبوں، دانشوروں اور حق پرستوں کی آواز کو کچلنے کے لئے عسکری قوتوں کی طرف سے جو بھی ظلم ڈھایا جاتا ہے ان سب کو حکیم بلوچ نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے حقیقت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔

حکیم بلوچ کے افسانے بلوچ سماج وثقافت اور بلوچ سرزمین کے تناظر میں لکھے گئے ہیں لیکن ان افسانوں کے مطالعے سے کسی بھی تعصب اور بلوچ ستائی کا شائبہ نظر نہیں آتا ہے۔ بس انھوں نے بلوچ سرزمین کے احوال کو اپنے افسانوں کے ذریعے دنیا کے مختلف خطوں میں پہنچا کر اپنے خطے کی بہترین ترجمانی کا اظہار کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں۔

> **"He achieves a creative magnificence and philosophical strength which is impossible to grasp if you turn away from your native expression, to me he is the same rustic and uneducated Baloch who upon arrival in a feast starts narrating his life experiences with a diffrenece that this Baloch puts them on paper and shares them with rest of the humanity"**

ترجمہ: ان کا فن تخلیقی ارتقاع اور فلسفیانہ قوتِ اظہار کی سرحدوں کو
چھو لیتا ہے کہ ان کو اپنی سرزمین اور ثقافت سے گہری وابستگی ہے بالکل ویسے
جیسے کہ ایک بادیہ نشین و بے تعلیم آدمی اپنی آپ بیتی سنا رہا ہو۔ فرق صرف اتنا
ہے کہ یہ بلوچ ان کو قلم و قرطاس کے حوالہ کر کے ساری دنیا کے پڑھنے والوں کو
ان میں شریک کر لیتا ہے[1]

حکیم بلوچ اپنی سرزمین کے بارے میں جس طرح کے افسانے لکھتے ہیں، ان میں وہ بلوچستان کے ایک سچے عاشق نظر آتے ہیں وہ اس سچے عشق کے دریا میں بہت جذباتی انداز میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے بلوچی افسانہ " کوہ، جنپ، چیدگ " کو لیجیے۔ جس کی شروعات حکیم بلوچ یوں کرتے ہیں۔

" واجہ گوشیت، بلوچستان نا چرائی حق نا زیات رسگائنت۔ واجہ
راست گوشیت کہ واجہ نا کس دروغ بند نہ کنت، ستر دل بہ لوٹیت، بلے دپ
گوشت نہ کنت "[2]

ترجمہ: جناب کہتے ہیں کہ بلوچستان کو ان کے حقوق سے زیادہ مل رہا
ہے مگر جناب ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ جناب کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا چاہے جتنا چاہے
مگر دل کی بات لب پر آ نہیں سکتی ہے "

جہاں یہ افسانہ سرزمین بلوچستان کے متعلق بہترین افسانوں میں سے ایک ہے وہاں اس افسانے کا بیانیہ انداز بھی بے مثال ہے۔ اس افسانے میں حکیم بلوچ نے اسم صفت " واجہ " استعمال کر کے پھر اسے جو لب و لہجہ دیا ہے وہ ہمارے سابق چیف آف آرمی سٹاف جناب پرویز مشرف کے ہاں نظر آتا ہے وہ ہر معاملے کی سنگینی کو کم یا ختم کرنے کے لئے غیر منطقی اور حقیقت کے بالکل برعکس بیان جاری

---

[1] حکیم بلوچ کی کتاب "Cobra's votive kiss" کے سرورق پر مستنصر حسین کا حکیم بلوچ کے فن افسانہ نگاری پر تبصرہ
[2] شہیدے ئے شپینی بچکند ص ۱۰۳

کرتا ہے۔مثلاً بلوچستان میں محض تین سرداروں کا مسئلہ ہے۔ٹماٹر مہنگا ہے تو سستی سبزیاں کھایا کرو۔یا بلوچستان کو اس کے حقوق سے زیادہ مل رہا ہے وغیرہ،اس قسم کے بیانات جو آمریت کے دور میں کسی منطقی جواز کے بغیر داغ دیئے جاتے ہیں ان کا جواب اگر کوئی دینا چاہے تو نہیں دے سکتا اگر بالفرض کوئی جواب دینے کی جسارت کرے تو اسے پہاڑوں کا رخ کر کے محاذ آرائی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

اس افسانے میں مجموعی احوال کے تحت یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر بوکھلاہٹ کا شکار اور آمرانہ ذہنیت رکھنے والا شخص سچ نہیں سن سکتا اور مظلوم شخص اپنے دل کی آواز کو ہونٹوں کی سرحد پار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

حکیم بلوچ بلوچستان والوں کی زندگی اور ان کے حالات کے ترجمان افسانہ نگار ہیں۔ان کے سارے کردار بلوچی سماج کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے کرداروں کو پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے کردار ہمارے درمیان مجسم و متحرک صورت میں موجود ہوں۔یہی حکیم بلوچ کی فنکاری کا بہترین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر علی دوست بلوچ نے حکیم بلوچ کے انگریزی افسانوی مجموعے "Cobra's Votive Kiss" پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف ادیب اور شاعر اکبر بارکزئی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں بارکزئی صاحب حکیم بلوچ کی فنی شہسواری کی متعلق کہتے ہیں۔

"Hakim's Technique and craftsmanship have transformed him into a master of fact fiction."[1]

حکیم بلوچ بلوچستان کے مزدوروں کی تنگ دستی، مجبوری ان کے ٹوٹتے ہوئے خوابوں اور آہوں اور انکے حالات زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جس میں ہر کردار اپنا تعارف خود کرتا ہوا نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر آپ کے انگریزی افسانہ "from Sickle to Scoop" کو لیجیے۔

۱۔روزنامہ جنگ جمعرات ۸ اپریل ۲۰۱۰ء

"Master please! Dont you know that uncle? He is a very good person. Now he is quite old, he can hardly work but he does not either leave the place or the work. He is very faithful and loyal. In good old days ,masters used to reward their loyal and faithful slaves to become the head of their estates and properties to manage it for them. But gone are the days of the master dom and slavery. yes! you are right those days have gone but masters and slaves still exist, only the colours have changed. Do you know one think? This old nako and master of this place of entertainment were both attendants to serve the customers: one rose to become the master, the other is still the same attendant. And the servant of his erstwhile fellow attendant.Now his servent, in fact yes, but rather that of his stomach. How nice would have been if

we were without stomach. what do you say............? perhaps, yes without a stomach human kind must be what its not, he could have lost his human being-ness.

ترجمہ: ماسٹر دیکھو! کیا آپ اس انکل کو جانتے ہیں؟ وہ بہت ہی مشفق آدمی ہیں۔ اب وہ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں اور کام بھی بہت مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن بیچارہ نہ اس کام کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ اس جگہ کو۔ یہ بہت ہی مخلص اور وفادار آدمی ہے۔ پرانے زمانے میں مالک اپنے غلاموں کو اپنے کاروبار اور جائیداد کا سربراہ رکھتے تھے لیکن اب وہ مالک اور غلامی کے دن کہاں رہ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

"ہاں! آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مگر یہ آقا اور غلام تو اب بھی موجود ہیں آپ کو پتہ ہے یہ بوڑھا نا کو اور اس کا مالک ایک وقت میں گاہکوں کی خدمت کے لئے یہاں مزدوری کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں سے ایک خود مالک بن گیا اور دوسرا ابھی نا کو اپنے اس ساتھی کا اب ملازم ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ ہم پیٹ کے بغیر زندہ رہ سکتے۔ کیا خیال ہے!

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، پیٹ کے بغیر انسان کی حالت اس طرح نہیں ہوتی جواب ہے اس نے تو ان حالات میں اپنی انسانیت کھو چکی ہے۔[1]

حکیم بلوچ کے افسانوں سے معاشرے کی غلط روایات اور رجحانات اور ان کے زیرِ اثر پیدا

[1] "Tears of Resurrection" ص ۱۴۸

ہونے والی نفسیاتی الجھنوں اور مفاسد کا بھرپور ادراک ہوتا ہے مثلاً افسانہ "بے گناہی کا گناہ" ملاحظہ ہو۔

"میرا گناہ کیا ہے اف! تم نے یہ کیا کیا" بندوق کی پہلی گولی جب زیبل کی مہندی لگی ہتھیلی میں لگی تو اس نے چیختے ہوئے کہا، اور سرد آہ بھرلی۔

دوستانے آگے بڑھ کر بندوق کو تھامنے کی کوشش کی اور کہا" کیوں !دراتم پاگل ہو گئے ہو"۔ درانے اس کو دھکا دے کر پرے کر دیا۔اور کہا۔

"مجھے مت روکو میں بور جان جیسا بے غیرت نہیں ہوں" اس نے دوسری گولی چلائی جو زیبل کے باہنے پستان کو چیرتی ہوئی دل کے آر پار ہو گئی اس کی آخری دردناک چیخ نکلی اور اس کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔۔۔۔

اب بیچاری پیر سال ملنگ کی بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ حقیقی واقعہ کو کس طرح بیان کرے مگر دل پر سنگ گران رکھ کر گویا ہوا۔

"بیچاری زیب جان نے آپ سے جھوٹ تو نہیں کہا تھا اس نے سچ بولا تھا خون تمھارا ہی ہے مگر بچہ تمھارا نہیں ہے۔ بچہ تمھارے بھائی کا ہے جس نے زیبل کو زور زبردستی سے اپنے قبضہ میں رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بور جان سے رہا نہ گیا اور اس نے پھر پوچھ لیا" مگر میں پوچھتا ہوں اسکو قتل کس نے کیا؟" ملنگ نے کہا" اس کو میرے سامنے تیرے ہی بھائی نے اپنی بندوق سے دو چار گولیاں ماردیں اور علی الاعلان کہا" میں بور جان جیسا بے غیرت نہیں ہوں "وہ میری نہ بن سکی اور کی بھی نہ بن پائے گی[1]

اس افسانے میں اولاد سے محروم ایک شخص نے خود کو سماج میں ایک معیوب شخص تصور کیا جس سے وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوا اس بنا پر اس نے اپنے بھائی کو اس کی بیوی کے خلاف گمراہ کر کے نوبت طلاق تک پہنچائی اور طلاق کے بعد اپنی بھابی سے زبردستی جنسی تعلقات قائم کر کے اس سے نکاح کرنا چاہا۔ مگر

---

[1] "بے گناہی کا گناہ" ماہنامہ بلوچیہ جولائی ۲۰۰۵ صفحہ نمبر ۱۱

مقصد پورا نہ ہو ہونے کی صورت میں اس نے اپنی بھابی پر عاصی ہونے کا الزام لگایا اور اسی الزام کے تحت اس نے ایک سماجی روایات کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر عزت و غیرت کے نام پر اسے قتل بھی کر ڈالا۔ اس افسانے میں حکیم بلوچ نے نہ صرف غلط رجحانات کو عورت کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنے اور عورت کی بے بسی و لاچاری کا مقدمہ عوام الناس کی عدالت میں دائر کرنے کے بعد خود وکیل بن کر جرح کرتے ہوئے نظر آتے ہے بلکہ عہدی رجحانات میں علامتی انداز میں جرم، بدی اور گناہ کے تمام مندرجات و جذیات کو اجاگر کر کے ایک تجزیہ نگار کی بھی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جناب مجاہد بریلوی صاحب" کتاب رسالہ "میں بلوچی کہانی کی روایت کی بیل پر کھلا پھول" کے عنوان سے زیرذکر افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "بے گناہی کا گناہ" ویسے تو غیرت کے نام پر قتل کی عام سی کہانی ہے لیکن افسانہ نگار کی نگاہِ دوررس اور وجدان نے مل کر ان تمام مضمرات اور رازوں کو یوں اجاگر کیا ہے جیسے وہ خود ان میں شریک ہو رہا ہو۔ وہ ناکردہ گناہوں کی مقتول و مظلوم خاتون کے مقدمہ کو معاشرہ (غار) وقت (میر چکی کے کاریز کا آب وروان) اور معاشرتی ضمیر (ملنگ بابا) کے استقلال و تعدل کے سپرد کر کے علامتوں کی تکونی ضرب سے ڈاکٹر زیبل کو اس مقام پر کھڑا کر دیتا ہے جہاں پر عہدی دور کی پاک دامن اور اسطوری بی بی ماہناز کھڑی ہے۔ تو بلوچی درخت کی بیل پر ایک شگوفہ کھل کر پھول بن جاتا ہے۔[1]"

حکیم بلوچ کے افسانوں میں تاریخ بھی ملتی ہے عموماً افسانہ نگار اپنے ہی دور کے ترجمان ہوتے ہیں لیکن حکیم بلوچ عہدی دور کا ترجمان ہونے اور مستقبل بینی کی بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ تاریخی پہلوؤں، خصوصاً نوآبادیاتی عہد کو بھی اپنے احاطہ افسانہ نگاری کے دائرے میں بند کرتے ہیں۔ جس سے آپ کے افسانوں میں تاریخ نویسی کا بھی رنگ نمایاں نظر آتا ہے مثلاً افسانہ "داغ زدہ روح"

---

[1] کتاب رسالہ مئی تا دسمبر ۲۰۰۹ء

کو لیجیے۔

"میر پائند خان کا چھوٹا بھائی علاقے اور قبیلہ کا سردار بن چکا تھا
انگریزوں نے اس کو باقاعدہ میر بھی مان لیا تھا اور میری کا عہدہ بھی سونپ دیا تھا
مقامی لیویز میں جمعدار بھی مقرر کیا تھا۔ اور بعد میں جب اس فورس کو ملیشیا کا
درجہ دیا گیا تو اس کی بھی ترقی ہوگئی اور صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز کر دیئے
گئے۔ لوگ پائند خان کو بھول گئے ان دنوں کسی کو خبر نہ تھی کہ پسند خان نے اپنے
بڑے بھائی سے دغا کیا تھا اور ان کو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار کروایا تھا۔ ویسے
بھی اس عہدے کا بڑا دبدبہ تھا بڑی شان وشوکت تھی اب پسند خان کا دور دورہ
تھا۔ پائند خان گمنامی میں کھو چکا تھا۔ لوگوں کو کیا خبر تھی کہ یہ شان وشوکت مال و
دولت پائند خان کی شہادت کا صلہ ہے جو اس کا دغاباز بھائی وصول کر رہا ہے۔[1]

اس افسانے میں سامراجی افواج کی نوآبادیاتی اور استحصالی نظام کے قیام میں ان کی کامیابی کی وجوہات کو حکیم بلوچ نے بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جن میں سب سے بڑی وجہ آپ کے ہاں اپنے ہی لوگوں کی چاپلوسی اور دغابازی ہے۔ کہ جنہوں نے بیرونی آبادکاروں کی معاونت کر کے اپنوں کا استیصال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس افسانے میں اس امر کی تصریح سامنے آتی ہے کہ غیر اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک گھر ہی کا کوئی فرد آستین کا سانپ نہ بنے۔

حکیم بلوچ نے اس افسانے میں سامراجی قوتوں کی مداخلت کو جہاں اپنے ہی لوگوں کو قرار دیا ہے وہاں انہی اپنوں میں سے آپ نے ایک مخلص نوجوان خاتون کا کردار بھی پیش کیا ہے جو انگریزوں اور ان کے حاشیہ برداروں کے ساتھ اپنے علمی اور تعلیمی ہتھیاروں کی بدولت ایک مزاحمتی تحریک کا آغاز کرتی ہیں اور ان ہی کے ذریعے فتح کا خواب سچی تعبیر میں بدل جاتا ہے اور اس فتح کے سورج نے پورب سے طلوع ہو کر اپنی روشن کرنوں سے اس حقیقت کو عیاں کیا کہ فتح ہر وقت باطل کے

---

[1] ماہنامہ بلوچیہ دسمبر ۲۰۰۹ ص ۶

خلاف حق کا ہی ہوتا ہے جس سے بعد میں لامتناہی حلقہ شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔حکیم بلوچ کے افسانے"داغ زدہ روح" پر تبصرہ کرتے ہوئے مجاہد بریلوی کہتے ہیں۔

اس کہانی میں پہلی نسل کا ایک سرکردہ راہ بر زندگی بھر نوآبادیاتی اور سامراجی افواج کے خلاف برسرپیکار رہتا ہے، مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا کہ اس کا اپنا چھوٹا بھائی اسے دھوکہ دیتا ہے لیکن دغابازی وغداری کا یہ کھیل دوسری نسل تک جاری رہتا ہے، تو تیسری نسل کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون اس کو کیسے برتری ہے۔وہ کہانی کا موضوع ہے اس کہانی کو مصنف نے پوری مزاحمتی تحریک کے تناظر میں یوں ابھارا ہے کہ آج ہی کا وقوعہ معلوم ہوتا ہے۔[1]

حکیم بلوچ کے افسانوں میں مجموعی زندگی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔آپ کے افسانوں میں ایک خاص بلوچی معاشرت اور ایک مخصوص بلوچی تہذیب وتمدن کو پروان چھڑنے کے باوجود ان میں پوری انسانیت کی نمائندگی نظر آتی ہے۔اور ہر خطے کا انسان آپ کے افسانوں میں اپنی ہی ثقافت اور اپنے ہی سماج میں رواں دواں اور ہنستا روتا ہوا نظر آتا ہے۔

---

[1] مجاہد بریلوی کتاب رسالہ مئی تا ستمبر ۲۰۰۹ء

حکیم بلوچ کی ادبی تنقید نگاری

حکیم بلوچ بنیادی طور پر نقاد ہیں آپ معاملے کے مختلف زاویوں کا بغور جائزہ لے کر تعمیری نکتے کو زیر بحث لاتے ہیں آپ تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں بلکہ آپ نے تعمیری تنقید کو اپنا شعار بنایا ہے حکیم بلوچ کی تنقید کے مطالعے سے آپ نظری تنقید اور عملی تنقید دونوں میں ماہر نظر آتے ہیں۔آپ مڈویک میگزین کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

> "ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ بلوچی ادب کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور اس کو تنقیدی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے تھے بلوچی کے کلاسیکی ادب پر لوگ لکھتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جو اس کا حق ہے پھر میں نے اور میرے کچھ دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ہم بلوچی ادب کا تنقیدی نظریے سے جائزہ لینگے تاکہ وہ لوگوں تک پہنچے میری خواہش یہ بھی تھی کہ میں بلوچی ادب میں تنقید کی روایت قائم کروں۔میرا پہلا مضمون جو کسی رسالے میں چھپا وہ تنقید کے حوالے سے تھا۔[1]"

حکیم بلوچ ایک منفرد اور جداگانہ تنقیدی نقطہ نظر کے مالک شخص ہیں آپ سماج کے ذمہ دار ارکان کے افعال و کردار کا تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں کہ جن لوگوں کا پیغام معاشرے پر زیادہ اثر

---

[1] روزنامہ جنگ مڈویک میگزین ۱۴ فروری ۲۰۰۱

ڈالنے کی قوت رکھتا ہے وہ لوگ کہیں خود کسی قسم کے نفاق یا دوغلا پن کے شکار تو نہیں ہیں آپ اپنی کتاب "ماتم دانش" میں کہتے ہیں۔

"آج کا تخلیق کار یا شاعر گفتار و کردار اور قول و فعل کے جن تضادات میں گرا ہوا ہے ان سے فرار کی کوئی راہ نہیں سوائے اس کے کہ قرآن پاک کی ان نشانیوں کی منور تاب ناکی میں ہر ایک کو اپنے کردار و افعال کو پرکھنے کا حوصلہ ملے اور اسے گران باری ایام کو خیر باد کہنے کی توفیق عطا ہو۔ میں اپنے گرد و پیش کے دانشورانہ ماحول کو جب بھی پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ایک گونہ وحشت سی ہو جاتی ہے غالب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔"

کبود پوشم و قرطاس پیراہن سازم گہے با ماتم دانش گہے بحسرت داد [1]

حکیم بلوچ کی کتاب ماتم دانش کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کا جو بھی تنقیدی نقطہ نظر سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ادب محض علاقائی سطح کی مروجہ شعر و شاعری اور افسانہ نگاری یا پھر تنقید برائے تنقید کا نام نہیں۔ بلکہ ادب عالمگیر اور ہمہ جہت مسائل کے حل، ہر جبر و استبداد اور آمریت کے خلاف قلمی مزاحمت کو استوار کرنے کا نام ہے جس میں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کا نظریہ پنہاں ہو اور ہمیشہ سچائی پیش نظر ہو، قطع نظر اس کے کہ حزب الشیاطین کے کاسہ لیسوں کی طرف سے جل و تلبیس اور سب و شتم کی آگ بڑھک اٹھتی ہو، مگر یہ حالت بہتر ہے اس امر سے کہ ادیب و دانشور ادب و دانش کی تعریف کا اطلاق جس چیز پر بتاتے ہیں مگر فعلی محل پر خود اس سے منحرف ہو جاتے ہوں۔

حکیم بلوچ کا ادب سے متعلق یہ تنقیدی نقطہ نظر ملکی و بین الاقوامی انتشار خصوصاً استعاری اور صیہونی قوتوں کی ایما پر ہر دور کے آمروں کا اور ان کے بعد ایک نہ ختم ہونے والا ضیاعی باقیات کا سلسلہ جوڑ جانے اور ادیبوں اور دانشوروں کا اس پہلو میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے پس منظر میں ہے۔

نائن الیون کے بعد امریکہ نے ایک غیر سیاسی بصیرت رکھنے والے شخص کو آلہ کار بنا کر ارضِ

---

[1] ماتم دانش اشاعت دوئم حکیم بلوچ ص ۱۲

پاک میں خودکش و بے خودکش جرائم کا لامنتہا باب کا افتتاح کیا جس کی آگ آج ساری دنیا کو اپنے مارج کی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ حکیم بلوچ اس ضمن میں ادب کو محض گنے چنے موضوعات پر پرکھنے کی بجائے وسیع تر بنیادوں پر یعنی ہر ظلم و تشدد، استحصال اور نا انصافی کے چہرے سے نقاب ہٹا کر استدلال اور منطقی بنیادوں پر دنیا کو باشعور کرنے پر یقین رکھتے ہیں آپ کے مطابق انقلاب کا آنا ادیب و دانشوروں ہی کی تحریکوں سے ممکن ہے جس سے وہ وقت ضرور آئے گا کہ جب ہم جشنِ دانش منائیں گے ۔مگر جب یہ صورت حال قائم رہی کہ اہل علم و دانش ہر ظالم و جابر حکمران کی چاپلوسی کرتا رہا یا پھر اس سے خوف زدہ ہو کر محض اپنے مخصوص صنفِ ادب کی بل میں چھپتا رہا تو تا ابد جشنِ دانش منانے کی بجائے ہر وقت ماتم دانش منانا ہمارا مقدر بن جائے گا۔

حکیم بلوچ ایک ہمہ جہت تنقید نگار ہیں وہ ہر شعبہ زندگی میں وسیع مطالعے کے بعد بہترین طرزِ نگارش کے ساتھ تنقیدی مفاہیم پیش کرتے ہیں آپ کی تنقید نگاری کے بارے میں سلطان محمود نیازی کہتے ہیں۔

> " حکیم بلوچ کی ادبی کاوشوں کا اہم ترین پہلو اس کا وسیع مطالعہ اور باریک نکتوں پر گرفت ہے۔ جو اسے ادبی تجزیہ نگاری پر مائل کرتی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہیں وہ فیض احمد فیض، مصطفیٰ زیدی، احمد فراز اور عطا شاد کے فن پاروں پر سر دھنتا ہے تو کہیں ملٹن شیلے، کیٹس اور شیکسپیئر کی شاعرانہ عظمتوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ میر چاکر خان ،میر دودا اور بالاچ کے قصوں پر رائے زنی کرتا ہے تو دوسری طرف حانی و شہ مرید اور سیمک اور ناتھا خان کی داستانوں پر بھی تنقید و تبصرہ کرتا ہے۔"[1]

حکیم بلوچ اپنی نگارشات میں ترقی پسند اور انصاف منش مفکر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شبیہہ شاد میں ایک طرف عطا شاد کی قدیم شاعری کے خیالوں کو مثالوں سے واضح کر دیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ

---

[1]۔ روزنامہ جنگ جمعرات ۱۶ اگست ۲۰۰۱

آپ نے عطا شاد کو ترقی پسندانہ سوچ کے ساتھ ہر ظالم و جابر اور قابض قوت کے خلاف آزادی اور انصاف کے لئے متحرک ہیرو کے میزان میں پرکھا ہے۔ مثلاً شبیہ شاد سے حکیم بلوچ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مغرب کی سیاسی و حربی بالادستی نے مشرق کی بستی کو آگ لگا دی مگر اس کا بے رحم دل پھر بھی موم نہ ہوا۔ اب انگاروں کے تڑپتے سمندر میں امید و آس کی تمنائیں پھر تڑپیں گی۔ بجلی بن کر گریں گی۔

آزادی کا موسم بہار ضرور آئے گا مگر اپنے وقت پر، شاعر اب قنوطیت سے آزاد ہو گیا ہے اسے یقین ہے کہ آزادی دانش و فکر ایسی فضاء میں نکھر سکتی ہے۔ جسے بادِ صبا کی بکھرتی خوشبوؤں میں نکھار کی صورت محسوس کیا جا سکتا ہے، دیکھا نہیں جا سکتا۔ آزادی اور امن کے پرستاروں کو تنبیہ کر دیتا ہے کہ اندھیری راتوں میں ہر چمکدار ستارہ چراغ شب کی طرح راہنما بن سکتا ہے جیسا کہ ہر اجالا صبح روشن دلیل نہیں ہے اس لئے ہر چمکتی شے کا پیچھا مت کرو، ورنہ ظلم اور انصاف میں تمیز نہیں کر سکو گے ظلم کے ہزاروں رنگ ہوتے ہیں ہزاروں نام ہیں جو ہر سو پھیلے ہوئے ہیں۔ امن و آزادی کے فرزند جن کے ساتھ ازل سے برسرِ پیکار ہیں۔ ظلم و جبر کے خلاف انہوں نے اندھیروں کو کاری ضربیں لگائیں جو کالی رات کے سینہ پر نمایاں ہیں۔ یہ زخم نہیں ہے اور نہ آج کی طرح لگے ہیں یہ عہد ماضی کی عالیشان جدوجہد کی سرفروشی کی داستانیں ہیں جو خونِ کفن میں لپٹی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔۔ اندھیروں میں لہو کے چراغ روشن کرو غلامی وزیردستی کو مٹانے کا یہی واحد راستہ ہے یہ عزم و عمل کا نہ صرف بھرپور ادراک ہے بلکہ مقصد حیات و فن سے مکمل وابستگی کا برملا اظہار بھی ہے"۔[1]

[1] شبیہہ شاد حکیم بلوچ اشاعت دوئم ص ۱۳۰۔۱۳۱

حکیم بلوچ عطا شاد اور اس کی شاعری کو جس تناظر سے دیکھتے ہیں اس ضمن میں محترمہ فہمیدہ ریاض حکیم بلوچ کی کتاب "مشبیہہ شاد" میں "محبت کی محنت" کے عنوان سے کہتی ہیں۔

"حکیم بلوچ نے بڑی خوبی سے عطا شاد کی نظموں کے اقتباسات کے ساتھ اپنے تبصروں سے گزشتہ نصف صدی کے اس وقوعے کو اجاگر کیا ہے کہ تیسری دنیا کے ایک ملک کے ایسے حصے میں جس پر عام طور پر صرف نظر کیا جاتا رہا ہے، آزادی اور انصاف کی تحریک کتنی جاندار اور روشن رہی ہے۔ انہوں نے عطا شاد کی شاعری کے ذریعے ایک طرح بلوچستان میں سیاسی آزادی جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے چلنے والی تحریکوں کی تاریخ بیان کر دی ہے" [1]

حکیم بلوچ اپنی تنقید نگاری میں تخلیق اور اس کے فن پارے کو تقابلی انداز سے پرکھتے ہیں جس سے اس تخلیق کار یا اس کے فن پارے کا صحیح معیار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی بلوچی تنقیدی کتاب "سنگ گران" کو لیجیے جس میں آپ "مئے نوکیں شاعری" کے عنوان سے عہدی بلوچی شاعری کو جس تنقیدی اسلوب سے پرکھتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

"مئے کہنیں شاعرانی تہا دو شاعرانت۔ آداں مئے نوکیں شاعرانی سرا کم باز اثر کرتہ۔ یکے ملا فاضل انت دگہ یکے جام درک انت۔ ہر کجام شاعرانی سرا کہ ملا فاضل ءَ اثر کرتہ، تہ آوانی سرا آیئے شاعری ءِ جوانیں پہنا داں اثر نہ کرتہ۔ بلکہ فارسی لوزانی کارمزکنگ و فارسی ترکیب ءِ بدین بدبختی ءَ اثر کرتہ۔ او آ وتی چگلیں اسرال ءَ ملا فاضل ءِ نام گرانت۔ وتی نزوری ءَ جوانی ئے شان دیگ ءِ جہدا کن انت۔ او ہر کجام شاعرانی شاعری ءِ سرا جام درک یا ہانی دشتئے مرید و ایند گہ ڈیہیاں واو لسی کسوان اثر کرتہ۔ آوانی شاعری چہ ایند گرانی شاعری ءَ ہزار

---

[1] مشبیہہ شاد حکیم بلوچ اشاعت دوئم ص ۹

درجہ گہہ انت۔ چونا گیشتر شاعرانی سرا فارسی وارددءِ شاعران ہواریں اثر ے
دور داتگ مئے جوانیں شاعران ءَ بایدانت کہ شاعری ءَ انچیں راہے پیش دار
انت کہ مئے نوکیں و آ دکیں شاعری ءَ چہ اے شومی ءَ بجڑا ئیگت او ہما
ڈولیں پہکیں شاعری ءِ بکنت کہ مئے گوشکیں شاعران حانی و شے مرید بیبرگ و
گراناز ی مہر و محبتی شعرانی تہا کرتہ۔اے باروا گرے (GRAY) ءَ جوانین
گپے گشتگ کہ شاعر ءِ تران مرچیش بہ بنت بلے آئی زوان زکین بہ بیت۔"[1]

ترجمہ: ہمارے پرانے شاعروں میں دو شاعر ہیں۔ جنہوں نے
ہمارے جدید شعراء پر تھوڑا بہت اثر ڈالا ہے۔ ان میں سے ایک "ملا
فاضل" اور دوسرا" جام درک" ہے جن شعرا پر ملا فاضل کی شاعری کا اثر ہے تو
ان پر ان کی شاعری کے اچھے پہلوؤں کا اثر نہیں پڑا ہے بلکہ وہ ان کی فارسی
تراکیب اور لفظیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کی غیر معیار
شاعری کو ملا فاضل سے منسوب کر کے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی جسارت
کرتے ہیں اور جن شعراء پر جام درک یا حانی و شئے مرید اور دیگر لوک کہانیوں کا
اثر پڑا ہے تو ان کی شاعری دیگر شعراء سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ویسے بیشتر
شاعروں پر فارسی اور اردو کا زیادہ اثر ہے۔ ہمارے شعراء پر یہ فرض عائد ہوتا
ہے کہ وہ عہدی دور کی شاعری کی جان کو اس صورت حال سے چھٹکارا دلائیں
اور شعراء کے لئے ایک ایسی راہ متعین کرنے کی سعی کریں کہ جس سے وہ ایک
ایسی خالص اور معیاری شاعری پیش کرنے کے اہل ہو جائیں جس کی مثال حانی
وشئے مرید، بیبرگ اور گراناز کے حسن و عشقیہ اشعار میں ملتی ہے۔اس تناظر
میں گرے (Gray) نے کیا خوب کہا ہے کہ شاعر کے کلام کا موضوع دور حاضر

[1] سنگ گران حکیم بلوچ ص ۳۵

کا ہو لیکن اس کی زبان گزشتہ (کلاسیکی) دور کا ہو"

حکیم بلوچ کی تنقید نگاری علاقائی یا خطہ گیر خیال کی حدود کو پار کرتی ہوئی عالمی نہج پر نظر آتی ہے۔ جس سے حکیم بلوچ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کی ہم رفتار نظر آتے ہیں۔ آپ کے فن تنقید نگاری کے حوالے سے مجاہد بریلوی صاحب ڈان اخبار میں "Love for creative word" (تخلیقی لفظ سے محبت) کے عنوان سے کہتے ہیں۔

"Hakim Baloch introduced literary criticism as a genre in Balochi literature which was rarely accepted as a form of literary expression with creativity in it. His evaluation and the crictical appreciation of classical Balochi poetry and Its folklore is unique in the sense that the author contemplates the process in the cosmic vision like that of a literary critique"of yore and places it in juxtaposition with the world view of a modern intellectual.

ترجمہ: حکیم بلوچ نے اس صنف (تنقید) کو نہ صرف نئے انداز میں متعارف کروایا بلکہ فن تنقید کو نیا عنوان اور نئی جہت بھی دی۔ کہ آپ نے اس کو ایک نادر تخلیقی انداز میں پہلی دفعہ بلوچی ادب میں متعارف کروایا۔ عہد حاضر و کلاسیکی ادب اور بلوچی عوامی ادب اور شاعری کو صاحب تحریر نے نئے انداز میں تعبیر و تفسیر سے ہمکنار کیا اور اس کو کائناتی وژن سے یوں ملا دیا جس طرح عہد

قدیم کے نقاد کیا کرتے تھے اور پورے بلوچی ادب کو عہد جدید کے دانشورانہ عالمی تناظر میں رکھ کر اس کو دنیا کے دیگر ادیبوں کے اور ادب کے شانہ بشانہ لا کھڑا کر دیا ہے۔[1]

حکیم بلوچ نے جہاں اپنی تعمیری تنقید کے ذریعے بلوچی ادب کی مختلف اصناف کے لئے مستقل اور سیدھی ڈائریکشن متعین کر کے ترقی پسند ادب کی راہوں کو ہموار کیا ہے۔ وہاں آپ بلوچی رسم الخط کے معاملے کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔

بلوچی ادب شب و روز ترقی کی منازل کو بڑی تیزی کے ساتھ طے کرنے کے باوجود رسم الخط کے معاملے میں اختلاف کا شکار ضرور رہا ہے۔ اور اس اختلاف نے بلوچی زبان و ادب کو دیگر ترقی یافتہ ادبیات کے برابر لانے اور آگے ترقی دینے میں کوئی رخنہ نہیں پیدا کیا ہے کہ ایک فروعی اختلاف ہے۔

بلوچی رسم الخط کے بارے میں چند ماہرین کی رائے ہے کہ چونکہ بلوچی ادب عالمی سطح پر متعارف ادب ہے اور عالمی سطح پر اس ادب کو ترقی دینے میں رومن رسم الخط بہت متاثر کن اور فائدہ مند ثابت ہوگا۔ خصوصاً سنٹرل ایشیا اور کینیڈا سمیت دیگر یورپی ممالک میں بلوچی ادب بہت ترقی کر سکتا ہے لیکن اس ضمن میں حکیم بلوچ بلوچی رسم الخط کو رومن یا عربی سانچے میں ڈھالنے سے پہلے چند سیاسی، جغرافیائی تمدنی اور تعلیمی حقائق کو سامنے رکھ کر اپنا تنقیدی نقطہ نظر بیان کرتے ہیں آپ روزنامہ مشرق میں "بلوچی کو ذریعہ تعلیم بنانا رسم الخط سے منسلک نہیں ہے" کے عنوان سے کہتے ہیں۔

> "سیاسی طور پر پاکستان کی قومی اور رابطہ کی زبان اردو ہے اور خود فی الحال بلوچستان کی سرکاری زبان اردو ہے سندھی پنجابی اور پشتو بھی عربی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے البتہ ان میں زبان کی انفرادی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی گئی ہیں ایسی تبدیلیاں کرنے کی بلوچی اکیڈمی پہلے ہی سفارش کر چکی ہے جغرافیائی لحاظ سے ہمارا ملک مشرق وسطیٰ کا حصہ ہے جس میں عربی اور فارسی

---

[1] ڈان اخبار ۲۰۰۰۔۰۱۔۳۰ء

زبانیں بولی جاتی ہیں۔اور یہ دونوں زبانیں عربی رسم الخط میں ہیں۔افغانستان اور ایران جو ہمارے قریبی ہمسایہ ملک ہیں ان میں بلوچوں کی کثیر تعداد آباد ہے جو عربی رسم الخط سے واقف ہیں۔اگر بلوچی کتابیں اور رسالے رومن رسم الخط میں شائع ہونے لگے تو ہمارے سرحد پار کے بھائی ہماری زبان کے ادب سے بہرہ ور نہ ہوسکیں گے کہ اور ساتھ ہی پاکستان کی دوسری قومیں بھی اس سے کما حقہ استفادہ نہیں کرسکیں گی۔تمدنی اور لسانی لحاظ سے بلوچی اُن زبانوں سے قریب ہے جو اس وقت عربی رسم الخط میں لکھی جارہی ہیں۔اب جبکہ قومی زبان اردو ہوگی اور عربی رسم الخط میں لکھی جائے گی تو پھر صوبائی زبان اگر رومن رسم الخط میں لکھی جانے لگے گی تو بچوں پر دو رسم الخطوں کا بے جا بار گراں انگریزی کو دیس بدر کرنے کے بعد بھی بدستور مسلط رہے گا۔اور اس طرح بچوں کی ذہنی صلاحیتیں منقسم ہونگی اور بچوں کا ذہن ترقی کے ابتدائی مدارج میں اس بار کا متحمل نہیں ہوسکے گا" [1]

[1]۔روزنامہ مشرق ۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء

حکیم بلوچ بحیثیت ڈرامہ نگار

ڈرامہ کسی بھی سوسائٹی کی سوچ اور خیالات کو درست سمت دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔
ڈرامہ معاشرے کو اچھے نظریے اور اچھی فکر سے ہم آہنگ کرنے کا ایک منفرد اور اچھوتا انداز ہے۔ جس میں معاشرے کو کرداروں کے ذریعے سمجھانے کا بہترین اسلوب اپنایا جاتا ہے۔

حکیم بلوچ نے ڈرامے کی اہمیت کے پیشِ نظر ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ریڈیو پاکستان کے لئے بہترین بلوچی ڈرامے پیش کیے ہیں۔ آپ کے ان ڈراموں کو عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی خصوصاً آپ کے ڈراموں میں آس ء چہر، روچ تہارانت، زرء چول، لالہ اور کیلگان بانوری سرئے گوپتہ بہت پسند کیے گئے جن کو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے مئی ۲۰۰۰ میں شائع کیا ہے۔

حکیم بلوچ کے ڈرامے اپنی شناخت اور اپنی قومی وثقافتی اقدار کے خلاف منفی رجحانات کو رد کرنے کے پسِ منظر میں لکھے گئے ہیں۔ آپ کے ڈرامے تنزل پذیر معاشرے کی نیم منہدم عمارتوں کو تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حکیم بلوچ کی ڈرامہ نگاری کے تناظر میں ڈان اخبار میں جناب مجاہد بریلوی لکھتے ہیں

The stories so realistically depict society's decadence and abuse of its once

honoured institutions that the reader is shocked to find himself vividly visualizing a drama being enacted upon the stage of real life.

ترجمہ: (حکیم بلوچ) کے ان افسانوں اور ریڈیائی کہانیوں میں انحطاط اور پرانی اقدار کو منفی انداز میں برتنے کے عمل کو اتنی حقیقت پسندی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو ایسے لگتا ہے کہ وہ بذات خود روزمرہ کی انحطاط پزیری کے ڈراموں کو خود اسٹیج پر دیکھ رہا ہے۔[1]

حکیم بلوچ کی ایک امتیازی جہت ان کے ڈراموں کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ آپ اپنی کہانیوں کو یونانی المیوں، لاطینی پلاٹ نگاری اور انگریزی مکالمہ نگاری کے امتزاج کے ساتھ اپنی سرزمین اور سماج کے تمام جزئیات کو ان کے گہرے نفسیاتی مطالعے کے بعد کرداروں کے مرقع میں برتتے ہیں اور یہی امتیازی اسلوب آپ کو فکشن نویسی اور ڈرامہ نگاری کی سلطنت میں شہنشائی کا تاج پہناتا ہے۔

۱۔ ڈان اخبار ۲۶ ستمبر ۲۰۰۰ء

باب سوئم

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری

حکیم بلوچ کی بین الاقوامی سیاست پر تجزیہ نگاری

حکیم بلوچ کی شخصیت جس طرح سے ہمہ گیراور ہمہ جہت ہے بعینہٖ آپ کی شخصیت کا ہرایک پہلو بھی ہمہ گیراور ہمہ جہت ہے آپ کی شخصیت کی جتنی بھی جہات ہیں ان میں سے ایک جہت تجزیہ نگاری بھی ہے اوراس تجزیہ نگاری کے ذریعے آپ بین الاقوامی، ملکی وعلاقائی اورصوبہ بلوچستان کے سلگتے مسائل کا بے لاگ تجزیہ کرتے ہیں جس میں آپ کبھی سیاسی مبصراور کبھی تاریخ نویس محقق کا روپ دھار لیتے ہیں۔ منصور بخاری حکیم بلوچ کی کتاب "عوامی دکھ کا سفر" کے سرورق پر حکیم بلوچ کی فگار نگاریوں کو بین الاقوامی، ملکی وعلاقائی مسائل کے علاوہ بلوچستان سے متعلق تنازعات کا ممکنہ حل اورعوامی محرومیوں اوران کے دکھ درد میں ان کا رفیق قرار دیتے ہیں۔

بین الاقوامی سیاست پر حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری نے عراق، مشرق وسطیٰ ، ایران اور افغانستان کے علاوہ پاک و ہند کشیدگی و مسئلہ کشمیر کے موضوعات کا احاطہ کی ہوئی ہے۔ جن کے مسائل کے بنیادی اسباب ان کے تجزیوں میں استعماری اور صیہونی طاقتیں یعنی امریکہ اوراسرائیل نظر آتے ہیں۔ حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری اتنی متنوع اور ہمہ گیر ہے کہ ایک موضوع کا تجزیہ پوری عالمی سیاست کا ادراک پیدا کرنے کے لئے کافی نظر آتا ہے۔ حکیم بلوچ کے تجزیوں اور تبصروں کا محورامریکی اوراسرائیلی مشترکہ سامراجی اور توسیع پسندانہ عزائم ہوتا ہے مثلاً ''امریکی غرور کدوں پر ابابیل کی یلغار'' کے عنوان سے ان کے ایک تجزیے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مغربی نام نہاد جمہوریتوں نے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شرق اوسط میں اسرائیل کی ریاست ارض موعود پر قائم کر دی اور اسی مختصر سی مملکت کو اپنے مفادات کے تحفظ میں مغرب کا ایسا طاقتور حلیف بنا کر بٹھا دیا کہ اسرائیل نے ہر جنگ جیت لی اور وسعت پذیر ہوا پھیلتا چلا گیا تا آنکہ مصر نے سر تسلیم خم کر دیا۔۔۔۔

امریکہ نے افغانستان کی اینٹ سے اینٹ سے بجا دی محاورہ تو یہ ہے۔ مگر اس نے پہاڑوں کو پہاڑوں سے بجا دیا اور بزور شمشیر قابض ہو کر اپنی کٹھ پتلی حکومت بنا دی جس کے صدارتی انتخابات اگلے ماہ ہو رہے تھے اور پھر عراق پر بھرپور حملہ کیا کہ وہاں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں اس پر قابض ہوا کچھ نہیں ملا تو کہنے لگا صدام کا القاعدہ اور نیو یارک اور واشنگٹن پر خود کش جہازی حملوں سے ضرور تعلق ہے مگر وہ بھی جھوٹ نکلا تو اب عراقی مزاحمت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا ہے کہ وہ ایشیاء روح کو بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ "سرداد" اور "دست داد" کو سمجھ ہی نہیں پایا کہ صحراؤں کی بے پایاں پہنائیاں صحرا نورد ہی جا سکتا ہے۔ جو ہواؤں سے فضاؤں سے چوروں کی طرح دور سے وار کرے۔ وہ ہماری واردات قلبی کی اساس کو کیسے جان سکتا ہے۔ آخر وہ سبق جو رب کعبہ کے طیر ابابیل نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے فیل والے متکبر بادشاہ کو دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر دہرایا جائے گا۔۔۔۔"[1]

اگر ذکر مسئلہ کشمیر کا ہو تو اس معاملے میں حکیم بلوچ کا موقف بالکل واضح اور دوٹوک نظر آتا ہے وہ کسی بھی غاصب و قابض سے حصول آزادی کے لئے لگا تار جنگ لڑنے، اپنے مقصد اور اپنی سرزمین کے ساتھ پرخلوص ہو کر متعین راستے پر استقلال اور ایمانداری کے ساتھ پیش قدمی

---

[1] ۔ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۱ء روزنامہ مشرق کوئٹہ

کرنے کے قائل نظر آتے ہیں اُن کا تجزیہ "پاک بھارت تعلقات ایک تجزیہ" کو لیجئے۔

"ہمارے اکثر تجزیہ نگار اور مدبر سوچتے ہیں کہ تقسیم ہند کا عمل اب تک جاری ہے اور کشمیر اس نا تمام عمل کا آخری مرحلہ ہے اور بدقسمتی سے ہندوستان کے حکمران بھی اسی سوچ کو سوچ رہے ہیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پہ اڑے ہوئے ہیں کہ ہم پاکستان کو مزید علاقہ نہیں دے سکتے۔ سقوط ڈھاکہ اور شملہ معاہدہ کے بعد دونوں ملکوں کے ایلیٹ کی سوچ میں تبدیلی آرہی تھی مگر وہ دیرپا بوجودہ ثابت نہیں ہوسکی کیوں؟ میں سمجھتا ہوں اس کی پہلی وجہ افغانستان کی جنگ تھی جو امریکہ اور مغربی دنیا نے سوویت یونین کے فوجی قبضے کے خلاف مجاہدین کے ذریعے برپا کی تھی اور سوویت یونین بے نیل مرام ہزیمت کا شکار ہو کر وہاں سے نکلا تو سولہ آزاد ریاستوں میں بٹ کر رہ گیا۔ کشمیری مجاہدین سرگرم ہو گئے۔ اسی امید کے ساتھ کہ پاکستان کی اخلاقی اور سفارتی امداد ان کو بالکل اسی طرح کی کامیابی سے ہمکنار کر دے گی اور ہندوستانی افواج بھی وادی جنت نظیر کو چھوڑ کر چلی جائیں گی مگر ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ اور اب تو چھ سات لاکھ کے لگ بھگ ہوگئی ہے۔ ہمارے تجزیہ نگار اور پالیسی ساز ایک اور حقیقت سے قصداً چشم پوشی کر رہے ہیں۔ بلاشک سوویت افواج چلی گئیں مگر ان کے خلاف مزاحم تنظیموں نے جو آگ افغان سرزمین میں لگائی تھی وہ اپنی جنگوں اور بربادیوں کے باوجود آج تک نہیں بجھی۔ طویل مزاحمتی جنگوں کا انجام ہر سرزمین پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ بے مقصدیت ان کو نہ صرف متعین راستے سے ہٹا لیتی ہے بلکہ ان میں شکست و ریخت کا ایسا عمل شروع ہو جاتا ہے جو ان کی ہیئت کو مسخ کر دیتا ہے اور پھر دہشت اور جہاد ایک ہی روپ میں نظر آنے لگتے ہیں"۔ [1]

---

[1] روزنامہ مشرق کوئٹہ اتوار ۲۳ دسمبر ۲۰۰۱

حکیم بلوچ کے ملکی سیاسی حالات پر تجزیے وتبصرے

حکیم بلوچ ملکی سیاست اور مسائل کا بے لاگ تجریہ کرتے ہیں۔ملکی سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے حکیم بلوچ حکمرانوں کی پچھلی غلطیوں ،اوران غلطیوں سے جنم لینے والے نا قابل تلافی نقصانات کو یاددلاتے ہوئے ماضی کی غلطیوں کو دوبارہ دہرانے سے خبردار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثلاً مشرقی پاکستان کی علیحدگی پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ہے جسے حکیم بلوچ ماضی کے حکمرانوں کی غلط پالیسوں کا خمیازہ قرار دیتے ہیں۔کہ جنھوں نے بنگالی عوام کے اعتماد پر پے در پے حملہ کیا جو کہ بعد میں سقوط ڈھاکہ کا موجب بنا۔اس معاملے میں حکیم بلوچ کی تنقید کا انداز واسلوب اور لب ولہجہ انتہائی غیر جانب دارانہ ہے۔مثال کے طور پران کی کتاب "عوامی دکھ کا سفر" میں بہ عنوان ''بے داغ سبزے کی بہار'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "یہ دوسرا پتھر تھا جو مسلم بنگال کے اعتماد کے آئینہ کو لگا پہلا پتھر اس وقت لگا جب اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا تھا بعد میں دونوں کا ازالہ ہوا بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔یوں دوقومی نظریہ کی جگہ دوقومی زبان کے عمل نے لی جس نے بنگلا کے مسلمان کو علیحدہ پن کا احساس دلایا اور یہی احساس اس اساس کا پیشرو بنا جو سقوط ڈھاکہ کے منطقی انجام پہ منتج ہوا۔"[1]

1۔عوامی دکھ کا سفر حکیم بلوچ ص ۲۲ء

حادثہ تقسیم بنگال کے تناظر میں حکیم بلوچ جس طرح ماضی کے حکمرانوں کی غلطیوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں اس کے متعلق حمید اختر روزنامہ "ایکسپریس" میں کہتے ہیں۔

''اس مجموعے (عوامی دکھ کا سفر) کے دوسرے مضمون ہی میں جو ۱۳ ستمبر ۲۰۰۱ کے روزنامہ مشرق کوئٹہ میں شائع ہوا مصنف نے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے ذکر سے آغاز کرتے ہوئے ۴۸۔۱۹۴۷ میں اس وقت کی حکومت کی کوتاہیوں کو بڑی وضاحت سے اجاگر کیا ہے جو بالآخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنیں۔اس میں قیام پاکستان سے قبل ملک کی تقسیم کے اس منصوبے کا ذکر بھی ہے جو وائسرائے نے قائداعظم کے سامنے رکھا تو انہوں نے ایسے کرم خوردہ پاکستان کو قبول کرنے سے انکار کیا مگر بعد میں مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی نے اس کرم خوردہ تجویز کو قبول بھی کرلیا۔ پھر صرف اردو کو سرکاری زبان قرار دینے اور سہروردی سے ہونے والے سلوک کی تفصیل کا احاطہ کیا گیا ہے۔جس سے مشرقی پاکستانیوں سے ہونے والے سلوک کی جھلکیاں عیاں ہوتی ہیں اور پڑھنے والا بنگلہ دیش بننے کی وجوہ سے پوری طرح آگاہی حاصل کرتا ہے'' [۱]

حکیم بلوچ نے اپنے تجزیوں اور تبصروں میں ہر دور خصوصاً غلام محمد، ایوب خان اور سکندر مرزا سے لیکر بھٹو عہد کے تمام سیاسی کھیلوں کا غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا ہے جو کہ صحافتی میدان میں گراں قدر خدمات کا واضح ثبوت ہے۔

حکیم بلوچ اپنی تجزیہ نگاری میں تعلیم کے شعبے کو بھی نہیں بھولتے ہیں آپ کی صحافتی نگارشات میں اس امر کی تصریح ہوجاتی ہے کہ آپ تعلیمی مسائل کا حل سیاسی ایجنڈے کے تحت نہیں چاہتے ہیں بلکہ آپ دانشوروں کی ماہرانہ آراء سے تعلیمی اصول اور پالیسی بنانے کے قائل ہیں۔آپ روزنامہ مشرق

۱۔ روزنامہ ایکسپریس ہفتہ ۲۹ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ بمطابق ۱۲ اگست ۲۰۰۸ء

میں "بلوچی زبان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ استصواب رائے کی بجائے ماہرین کی سطح پر طے ہونا چاہئیے" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"میں ارباب بست وکشاد اور دانایان قوم سے گزارش کرنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ علمی، فنی اور تعلیمی مسائل کو سیاسی مسائل کی طرح گلیوں میں نہ لے جائیں ان کو بیان بازی سے دور رکھیں اور ان کو اس طرح سلجھائیں جس طرح کہ علمی اور دانشور حلقوں کی ریت ہے۔"[1]

بحثیت ایک دانشور حکیم بلوچ مادری زبان میں تعلیم کو رائج کرنے کے حق میں نظر آتے ہیں۔ مشرق اخبار میں ایک انٹرویو کے دوران پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں آپ کہتے ہیں۔

''مادری زبانوں میں تعلیم انسانوں کا بنیادی حق ہے بچہ اپنی مادری زبان میں پڑھتا ہو تو اسے جلد ہی از بر کر لیتا ہے۔ ہمارے بچے قاعدے کا پڑھنا جب شروع کرتے ہیں تو الف ''انار'' کو انار سمجھتے ہیں مگر ب'' بکری'' کو ب ''بز'' پڑھ جاتے ہیں اس لئے کہ وہ بکری کا فوٹو دیکھتے ہیں تو فوراً نہیں جان سکتے کہ بکری بز ہے۔ اسی طرح بچے کے نازک ذہن پر بوجھ بڑھ جاتا ہے جبکہ بز پڑھتے ہوئے ان کا ذہن اسے قبول کرتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں۔ میں تو زور دے کر کہوں گا کہ پرائمری کی سطح تک بچوں کو مادری زبان میں ہی پڑھایا جائے۔ اس کے بعد اردو اور انگریزی سے واسطہ پڑے گا۔ دوسرے علوم کے حصول میں دوسری زبانیں سیکھنی چاہئے مگر Medium of instruction مادری زبان ہی کو ہونا چاہئیے۔''[2]

حکیم بلوچ مادری زبان میں تعلیم کے رائج نہ ہونے کے معاملے میں بہت حساس اور پر خلوص

---

[1]۔ روزنامہ مشرق کوئٹہ جمعرات ۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء

[2]۔ روزنامہ مشرق جمعرات ۳۰ نومبر ۲۰۰۰ء

نظر آتے ہیں آپ اس امر کو بچوں کے ساتھ زیادتی گردانتے ہیں۔ جیسا کہ گلف نیوز (Gulf News) دبئی کے ایک سٹاف رپورٹر نے Abdul Hakim Baluch-from Government Official and author. کے عنوان سے رپورٹ تیار کی ہے جس میں رپورٹر حکیم بلوچ کے تجزیے سے ایک اقتباس تحریر کرتے ہیں کہ۔

"The other setback, he added, is depriving people of the opportunity to learn in their own mother tongues.

ترجمہ: انہوں نے کہا ہے کہ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ (پاکستان میں) بچوں کو ان کی مادری زبان میں پڑھنے اور سمجھنے سے محروم کیا جاتا ہے۔[1]

حکیم بلوچ مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت کے سخت خلاف ہیں۔ فرقہ واریت کے خلاف آپ کے نقطہ نظر کی انفرادیت اس لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ آپ قادیانیوں کو پارلیمنٹ کی سطح پر غیر مسلم قرار دینے کے عمل کو بھی فروغ تفرقہ بازی اور انتہا پسندانہ کاوش سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں اس امر کی دلیل ملتی ہے کہ آپ مذہب کا ریاستی معاملات میں عمل دخل کے قائل نہیں ہیں۔ کیوں آپ کے مطابق پھر مذہب سٹیٹ کا ماتحت بن جاتا ہے۔ آپ اپنی کتاب ''عوامی دکھ کا سفر'' میں ''پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کو روکیے'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''آپ اسے کچھ بھی کہیں بنیاد پرستی، مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی یا فرقہ واریت، لیکن حقیقت اپنی جگہ واضح ہے کہ جب سے ذوالفقار علی بھٹو نے مذہبی عناصر کے سامنے جھکتے ہوئے پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے

---

[1] دبئی گلف (Gulf News) ہفتہ ۹ جون ۲۰۰۱ء

(Page 1 of 2) http://www.gulf_news.com/articles people _places.asp?article I D=1913

ذریعے احمدیوں اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا اس وقت سے پاکستانی معاشرے کے کسی بھی رکن کا مذہب ریاست کی ملکیت بن گیا اور مسلمان کا وجود قانونی اور سیاسی حوالے سے قابل تشریح ہو گیا اور فرقہ بندی کے خوابیدہ بیج جو ۱۹۴۹ میں قرارداد مقاصد کے وقت ڈالے گئے تھے ۱۹۷۵ء میں دوبارہ پھوٹنے لگے۔ بحثیت ایک سچے مسلمان کے میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص یا فرقہ جو حضور پاکؐ کے آخری نبی ہونے پر یقین نہیں رکھتا بڑا گناہ گار ہے۔ اس کی سزا یہاں اور آخرت کی زندگی میں بھگتنا ہوگی یہاں پر سماج اور اس کے بعد آنے والی زندگی میں خدا اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ ایسے گناہگار کو کیا سزا ملنی چاہیے۔ ایسے معاملے میں قانون سازی سے مذہب سیکولر بن جاتا ہے اور سیاست ایک مذہبی ریاست بن جاتی ہے"۔[۱]

درجہ بالا اقتباس میں حکیم بلوچ جب لفظ "مذہبی عناصر" استعمال کرتے ہیں اور ان مذہبی عناصر میں سے جب آپ کسی کا نام واضح طور پر لیتے ہیں تو وہ مولانا مودودی ہوتے ہیں۔ آپ مولانا مودودیؒ کو ایک ایسے اسلامی مفکر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ کہ جن کی جماعت کے نظریات کو بنیاد بنا کر وزیراعظم لیاقت علی خان نے مذہبی فرقہ واریت کی داغ بیل ڈال دی۔ اسی عنوان کے تحت آگے جا کر آپ کہتے ہیں۔

"بانی پاکستان نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ مذہب کا ریاست کے معاملات میں کوئی سروکار نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وزیراعظم لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے لئے مولانا مودودیؒ [۲] کو ۱۹۴۹ میں چنا اور اسے آئین سازی کی بنیاد بنایا جو کہ پاکستان کی تمام آئینوں پر اثر انداز ہوتی رہی حالانکہ

۱۔ عوامی دکھ کا سفر حکیم بلوچ ص ۵۲

۲۔ پاکستان میں جب بھی کسی شخص یا گروہ کے نام کے ساتھ فرقہ پرستی کا سمبل لگتا ہے تو عموماً یک دم سے اس کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ شخص اپنے ہی مسلک کو دین خاص سمجھ کر شیعہ، سنی بریلوی وغیرہ کے فروعی مسائل جیسے

جناب سہروردی اس پالیسی کے بارے میں بہت تکلیف دہ احساس رکھتے تھے وہ قرارداد مقاصد پر تنقید کرتے تھے ان کے خیال میں اس کی وجہ سے فرقہ واریت نے جنم لینا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ [1]

اختلافات کے معاملے میں انتہا پسندی اور فرقہ پرستی کے قائل ہیں اس لئے میں یہاں اس امر کی تصریح سمجھتا ہوں کہ حکیم بلوچ کا مولانا مودودیؒ کے بارے میں صفتِ فرقہ پرست اور انتہا پسند کے انتساب سے حکیم بلوچ کے موقف سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ آپ فروعی مسائل میں مولانا کے مؤقف کو فرقہ پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں ختم نبوت کو نہ ماننے یا آنحضرت ﷺ کی رسالت کو مشروط بنیادوں پر استوار کرنے جیسے نصوص صریحہ سے ثابت احکام سے اعراض و انکار کے پیش نظر مولانا کا قادیانیوں اور احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے اقدام کو بھی حکیم بلوچ فرقہ پرستی اور انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ کے مطابق گناہ گار کو انکے گناہ کی سزا تو آخرت میں ملنی چاہیے پارلیمنٹ میں نہیں۔

[1] عوامی دکھ کا سفر ۵۲۔۵۳ اور روزنامہ مشرق ۵ جنوری ۲۰۰۲ء

حکیم بلوچ کی بلوچستان کے مسائل پر تجزیہ نگاری

اگر حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری کا ذکر بلوچستان کے سلگتے مسائل کے حوالے سے ہو تو اس میں آپ بہ یک وقت سیاسی اور تاریخی تجزیہ نگار کے روپ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں جس میں آپ ماضی اور حال کے پسِ منظر میں بلوچستان کے ساتھ ناانصافی اور بلوچستان کے مسائل کا کماحقہ تجزیہ کرتے ہیں۔ جس سے عوام الناس خصوصاً علم سیاسیات اور تاریخ کے طالب علم بہ احسن طریق سے بلوچستان کے سیاسی اور تاریخی حقائق سے مستفید و آگاہ ہو سکتے ہیں جیسا کہ حمید اختر، حکیم بلوچ کی کتاب "بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت" کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "تاریخ اور سیاست کے طالب علموں کے لئے حکیم بلوچ کی اس کتاب میں انتہائی مفید مواد دستیاب ہے جن لوگوں کو اس صوبے کے پیچیدہ صورتحال کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اس کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔"[1]

حکیم بلوچ بلوچستان میں اکبر بگٹی کی شہادت کو ظلم و استبداد اور آمریت منشوں کا بلوچ قوم کو کمتری کا احساس دلانے، ماتم منانے پر مجبور کرنے اور بلوچ قوم کے اس ماتم منانے پر خود جشنِ ماتم منانے کا زعم قرار دیتے ہیں۔ مگر حکیم بلوچ ماتم منانے کی بجائے نواب صاحب کی شہادت کو ذریعہ

1۔ روزنامہ ایکسپریس لاہور ہفتہ ۲۱ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

کامیابی و کامرانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگلش ہفت روزہ رسالہ "Balochistan calls being heard" کے عنوان سے جناب منصور اکبر کنڈی صاحب حکیم بلوچ کی تصنیف بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" The writer is very sensitive about the death of Nawab Bugti...... his death serves as a martyr role model for nationalists and non-nationalists in the pursuit of their interests"

ترجمہ: مصنف نواب بگٹی کی شہادت پر بہت حساس نظر آتے ہیں۔۔۔ وہ ان کی شہادت کو قوم پرست اور غیر قوم پرستوں کے لئے اپنے حقوق کے حصول کے لئے مشعل راہ قرار دیتے ہیں۔" [1]

حکیم بلوچ اکبر بگٹی کی شہادت سے جس قسم کا احساس رکھتے ہیں اس کی مثال ہمیں آپ کی کتاب "بلوچ قومیت، خانیت سرداریت" کی ابتداء میں یوں ملتی ہے۔

"نواب شہباز اکبر بگٹی کی شہادت سے سارا پاکستان ہل گیا اور سارے بلوچستان میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ۲۶ اگست ۲۰۰۶ کا دن عالمی تاریخ میں ایک یادگار دن بن گیا۔ ارسطو میں شاعری میں ادب میں نواب اکبر خان بگٹی اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جو بطل ہائے جلیلہ کا موعودہ مقام ہوتا ہے جسے ہر دور میں جابر چھیننے کی کوشش میں جانے اور انجانے میں اپنے ظلم و جبر، زہر، تلوار، تیر و تفنگ اور اب راکٹوں اور میزائلوں کی ہلاکت آمیزیوں میں ڈال کر ان کو خود

---

[1] تحریر منصور کنڈی روزنامہ "Independent" ۲۰۰۷-۱۰-۴ جلد نمبر ۶

(Page 1-3)http://www.weeklyindendent.com. Pk/review.htm

ہی اس مقام جلیلہ پر فائز کرتے ہیں، کرتے آئے ہیں اور کرتے رہینگے۔ نیکی اور بدی، حق اور ناحق، ظلم اور انصاف کی یہ جنگ ازل سے ابد تک لڑی جاتی رہے گی۔ تاریخ ساز پیدا ہوتے رہیں گے تاریخ کے مارے دستِ قاتل سے شہادت پاتے رہینگے۔ حریت پسند جب اذیت گاہوں میں دردناک سزاؤں کو مردانگی سے بھگتتے ہیں تو ظالم یقین کرلیتا ہے کہ اس نے خاموشی سے ان کی آواز کو خاک وخون کے ملبے تلے دبا ہے۔ مگر وہ بیج بن کر زمین بوس ہو جاتا ہے زیرخاک رہتا ہے اور منتظر رہتا ہے کہ آزادی کی دیوی علاتوں آئے گی۔ اس پر آب حیات چھڑکے گی اور بابلی ہیرو طاموس جیسے زندہ ہوکر واپس جہانِ آب و تاب میں آئے گا تو جہان "نوخیں روشِ" (نوروز) کا جشن منائے گا"۔[1]

حکیم بلوچ جب تاریخ بلوچستان اور اس کے مسائل وتنازعات کا ادارک پیدا کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو اس میں آپ ایک تاریخ نویس کا روپ دھارتے ہیں آپ کی تاریخ نویسی کے تناظر میں حکیم بلوچ کی تصنیف ''بلوچ قومیت'' کا مطالعہ کرتے ہوئے پروفیسر سلطان محمود نیازی کہتے ہیں۔

"یہ کسی سیاسی مقرر یا Rhetorist کا انداز بیان نظر نہیں آتا بلکہ ایک تاریخی تجزیہ نگار اور مفکر کی عملی تحقیق کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے۔"[2]

حکیم بلوچ بلوچستان کا ایک آزاد ریاست نہ بننے پر اظہار تاسف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اور توجیہہ اس دور کے خان اور سردار کے باہمی نزاع کو سمجھتے ہیں۔ وہ تاریخی حقائق کی روشنی میں ریاست قلات کی خودمختاری کے استحکام کے ٹوٹتے ہوئے خواب کی وجہ کی تشریح کے لئے اپنی کتاب "بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت" میں ''رابرٹ سنڈیمن کا کرشمہ'' کے عنوان کے تحت حکومت ہند کی ایک دستاویز کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1]۔ بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت ص ۱۷

[2]۔ ماہنامہ بلوچیہ جون ۲۰۰۷ ص ۱۷

"ہمارے وقتوں میں قلات کی تاریخ شروع ہوتی ہے ایک ختم نہ ہونے والی جنگ سے جو خان اور اس کے سرداروں کے درمیان چھڑ چکی تھی کہ خان فرد واحد کی مطلق العنان اپنی حکومت قائم کرنے پر تلا ہوا تھا اور سردار اپنے وفاقی حقوق کے لئے برسر پیکار تھے یہ جنگ یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اس کے نتیجے میں قلات کی خانیت ختم ہو سکتی تھی مگر سنڈیمن کی مداخلت نے صورت حال کو قابو کر دیا۔" [1]

حکیم بلوچ بلوچستان کے ابتدائی خدوخال اور تاریخی حقائق بیان کرتے ہوئے جس نکتے کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ یہ کہ ایسے کون سے عوامل تھے اور کون سی وجوہات تھیں جنھوں ایک آزاد اور مختار ریاست کو اس کی اپنی مستقل آزادی اور خودمختاری کے استحکام سے محروم کر دیا۔ جیسا کہ راحت ملک صاحب کہتے ہیں۔

جناب حکیم بلوچ، بلوچ اور بلوچستان کے بارے میں کچھ خوابوں کی تعبیر تلاش کرتے نظر آتے ہیں مستقبل کے تناظر میں نہیں بلکہ تاریخ کے پہلوؤں میں اور وہ بھی گہری بصیرت اور رموز کے ساتھ، ان کا بنیادی تھیسز یہ ہے کہ کیوں ریاست قلات (بلوچستان) ایک خودمختار آزاد ریاست نہیں بن پائی؟ [2]

بلوچستان کم و بیش دو سو برس کے عرصے میں اپنے وسائل اور حقوق سے بے بہرہ ہے اس کی بنیادی وجوہات حکیم بلوچ کے ہاں بیرونی قوتوں کی اپنے مفادات کی خاطر مداخلت اور اس خطے میں تنازعات و باہمی چپقلش نظر آتی ہیں مگر حکیم بلوچ اس ضمن میں ماضی و حال کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے گلہ مند نظر آتے ہیں کہ ماضی کی بیرونی استحصالی قوتیں اتنا بے رحم اور سفاک نظر نہیں آتی ہیں جتنا کہ

۱۔ بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت حکیم بلوچ ص ۵۷

۲۔ ماہنامہ بلوچیہ ۲ جون ۲۰۰۷ ص ۱۳

موجودہ دور کے اندرونی قوتیں سفاک اور بے رحم ہیں مصنف "بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت "بہ عنوان رابرٹ سنڈیمن کا کرشمۂ رقم طراز ہیں کہ۔۔۔

"تاریخ کی ستم ظریفی دیکھ لیں کہ 130 سال پہلے پنجاب کے انگریز آفیسروں نے بلوچوں کے مسائل حل کرنے کے لئے حکومت (خان) اور سردار کے درمیان الجھنوں کو سلجھانے کے لئے فوجی حملوں کے وسیلہ کو مقدم نہیں جانا اور آج پنجاب کے مسلمان آفیسر (فوجی) صرف فوجی طاقت کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں" [1]

---

[1] بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت ص ۶۲ حکیم بلوچ

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری میں ادبی، دینی اور فلسفیانہ رنگ

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری کا جہاں مآخذ سیاسی و تاریخی علم کا کما حقہ ادراک ہے وہاں ادبی و تخلیقی، دینی و فلسفیانہ محاسن لیے یہ تجزیے و تبصرے قاری کی دلچسپی کو اس نہج پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں مطالعے کے سمندر کے آب بے حساب کو مطلقاً نوش کرنے کا زعم بھی تشنگیء مطالعہ کو بجھانے کے لئے تسکین و طمانت کی آس پیدا نہیں ہونے دیتا۔

حکیم بلوچ ایک ادبی شخصیت ہیں اور ادبی رنگ ان کی تجزیہ نگاری پر بھی یلغار کرتا نظر آتا ہے جیسا کہ حمید اختر حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری کے حوالے سے کہتے ہیں۔

"مصنف کی تحریر ادبی اور تخلیقی محاسن سے مزین ہے۔"[1]

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری میں المیہ نگاری بھی نظر آتی ہے۔ انگریز ڈرامہ نگار شیکسپیئر کی ڈرامہ نگاری کا سلوب نظر آتا ہے جن کے کردار اکثر امراُ و رؤسا اور طبقہ اشرافیہ ہوتے ہیں جس سے جنم لینے والا المیہ ڈرامے کو ایک دلچسپ موڑ سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری میں بھی استحصالی قوتوں اور مظلوم اشرافیہ کے مابین کردار نگاری نظر آتا ہے۔

ان کا مضمون "امریکہ، ایران، اسرائیل" کو لیجیے۔

"امریکہ نے صدام کو شکست اور کویت کو روس سے قریب ہونے کی

---

[1] روزنامہ ایکسپریس ۱۲ اگست ۲۰۰۱ء

سزا کی عجیب ترکیب نکالی، صدام سے ہاں کہا اور مکر گیا۔ حملہ کے بعد اسے نہ صرف کویت سے نکالا بلکہ حملہ آور ان کو گردان کر اقوام متحدہ سے عراق کے خلاف پابندیاں لگوا دیں اور تاوان جنگ وصول کروالیا مگر کویت اور سعودی بادشاہوں سے حمایت کے دام وصول کرتا رہا"۔ ۱

اس مضمون میں امریکہ ولن، ایران ہیرو اور اسرائیل لومڑی کے کردار میں نظر آتا ہے باقی ہر کردار (ہر دوسرا متعلقہ ملک) امریکہ کے سامنے کسی نہ کسی ایسے کا شکار ہو کر ہارا ہوا نظر آتا ہے۔

حکیم بلوچ اپنے تبصروں اور تجزیوں میں اپنے موٗقف کی وضاحت کے لئے شعراء کے کلام بھی شامل کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی تصنیف "زیر سایہ خورشید" (جن کے زیادہ تر مضامین روزنامہ انتخاب میں شائع ہو چکے ہیں) کو لیجیے۔ جس میں آپ "واشنگٹن 99-66 تاشقند" کے عنوان سے جس طرح اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"امریکی جنرل زینی آیا، ہمارے عسکری اولوالامر جنرل مشرف سے ملاقات کی تو معاملہ عسکری سطح پر تقریباً طے کر چکا۔ جس کو سیاسی سطح پر طے ہونا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ زیادہ معتبر دکھائی دے کر گل میں جو خون برسا تھا وہ یتیم لہو تو نہ تھا بے سراغ اور بے اثر رہتا"۔

پکارتا رہا بے آسرا، یتیم لہو کسی کو بہر سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ۔ ۲

حکیم بلوچ اپنی تجزیہ نگاری میں تشبیہاتی و استعاراتی زبان میں بات کرتے ہوئے بہترین تلمیحات سے بھی اپنی نگارشات کو مزین کرتے ہیں۔ "زیر سایہ خورشید" میں بہ عنوان "ترازو اور توازن" ان کی اسی قابل ستائش طرزِ تحریر اور نثر نگاری کی مثال ملاحظہ ہو۔

"ان دنوں ہمارے اخبارات کی شہ سرخیاں، حکم و عدل کے طبل

۱۔ عوامی دکھ کا سفر حکیم بلوچ ص ۴۲۳

۲۔ زیر سایہ خورشید حکیم بلوچ ص ۱۶۹

جنگ کی آوازیں کس رہی ہیں۔اور دانش و رموز مملکت سپرد خسرداں کئے ان شاہکاریوں اور آہن کاریوں پر ماتم کناں بھی ہے اور فریادی بھی اس "یاس و حسرت سے حیران ہوئی جاتی ہے مانند زن نغمہ گر کہ کس سے آرزوئے وصل کرے شہر میں کوئی مرد نہیں قصر گل کا مرداول آہن ساز ہیں۔اور کوزہ گروں کی مٹی سے جام جم کے جوہر کی تمنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جیسا کہ حافظ کہتا ہے۔

جوہر جام جم از کان جہان دگر است

تو تمنا از خاک کوزہ گراں می داری [1]

حکیم بلوچ چونکہ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ابتدائی تعلیم دینی علوم سے ہی ہوئی ہے اس لیے آپ کی تجزیہ نگاری میں بھی دینی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے آپ بعض مقامات پر قرآنی ارشادات اور فرمودات ہی کو اپنے مضامین کے لئے بطور عنوان اخذ کر لیتے ہیں مثال کے طور پر روزنامہ مشرق میں آپ کے ایک مضمون کا عنوان "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو" قرآن پاک کی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ کا ترجمہ ہے۔

حکیم بلوچ قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس طرح تجزیہ نگاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اس میں آپ بہ یک وقت مفسر اور مصلح کی خوبیاں سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔آپ اپنی کتاب "عوامی دکھ کا سفر" میں "امریکی غرور کدوں پر ابابیل کی یلغار" کے عنوان سے قرآن پاک کے تیسویں پارے کی سورۃ فیل کی روشنی میں اسرائیل اور امریکہ کو تنبیہ اور ان کا اصلاح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"الہامی کتابوں کو پھر سے پڑھو اور اصحاب فیل کی بربادی سے عبرت پکڑو فلسطینی بچوں کے غلیل سے نکلی ہوئی کنکریاں یقیناً تمھارے لیے

۱۔ زیر سایہ خورشید حکیم بلوچ ص ۱۲۸

ابابیل کی ننی چونچ سے نکلی ہوئی کنکریاں بن جائیں گی یقین نہیں آتا تو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دو کنکر اور پینٹا گون پر ایک کنکر نے آقائے یک جہاں کے غرور و اقتدار کی علامتوں کا ابرہہ کے ہاتھوں جیسا حشر کر دیا یا نہیں ۔۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ باقی ہاتھیوں پر ابابیل پتھر برسائیں یا چیونٹی ہاتھی کے نتھنوں میں گھس جائے ، اے اہل غرب دلیل کا راستہ اپناؤ غرور اور تکبر کا راستہ چھوڑ و اللہ تعالیٰ کو تکبر بالکل پسند نہیں ۔ وہ ہر گنا معاف کر دیتا ہے مگر تکبر ایسا گناہ ہے جو اپنی سزا آپ ساتھ لاتا ہے۔ متکبر فرد یا اقوام کو اپنے ہی ڈائنیولک نظام میں نیست و نابود کر دیتا ہے " ۱

حکیم بلوچ اپنی تجزیہ نگاری میں جہاں قرآن وحدیث کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہوئے واعظ و مصلح اور دینی اسکالر نظر آتے ہیں وہاں وہ اسلامک ہسٹری سے بھی مثالیں دیکر ماضی کی غلطیوں کو دہرانے کے پیش نظر آئندہ جس طرح کی تباہی و بربادی آسکتی ہے ان سے خبر دار کرتے ہوئے ایک مستقبل بین تعبیر دان نظر آتے ہیں۔ اسی تناظر میں آپ روزنامہ مشرق میں بہ عنوان " بے داغ سبزے کی بہار" کہتے ہیں۔

"۲۱ فروری ۱۹۵۲ء میں خون کا پہلا قطرہ پاکستان مسلم قومیت کے دامن پر ایسے ٹپکا جیسے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا حضرت نائلہؓ کے لباس پر ٹپکا تھا گو کہ حضرت عثمانؓ فسادیوں کو بار بار تنبیہ کرتے رہے کہتے رہے کہ موت کا مجھے کوئی خوف نہیں مگر مجھے قتل مت کرو اس لیے کہ اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر نہ اکھٹے نماز پڑھ سکو گے اور نہ اکٹھے جہاد کر سکو گے مگر مفسدین نے وہی کیا جو ان کو کرنا تھا اور تاریخ نے بھی وہی کیا جو اس کو کرنا ہوتا ہے۔ " ۲

۱۔ عوامی دکھ کا سفر ص ۲۶ حکیم بلوچ

۲۔ عوامی دکھ کا سفر حکیم بلوچ ص ۲۰

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری فلسفیانہ اسلوب کا حامل ہے آپ ایک بلند پایہ اور مانے ہوئے دانشور ہیں چونکہ دانش و فلسفہ کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس لیے حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری فلسفیانہ ارتفاع کے آسمانوں کو چھو لیتا ہے۔ پروفیسر سلطان محمود نیازی آپ کے تجزیوں اور تبصروں کے مجموعے "بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت" کا مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"فلسفیانہ انداز گفتگو کے لحاظ سے کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو جگہ جگہ ہمیں فلسفیانہ انداز فکر پوری رعنائی کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے۔"[1]

حکیم بلوچ کے تجزیوں اور تبصروں میں فلسفیانہ رنگ جس خوش اسلوبی سے جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مثال ہمیں آپ کے مضمون ''بہ عنوان بلوچ، بلوچستان اور حکومت پاکستان'' سے ملتی ہے۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ گزشتہ چھ سالوں کے تمام سیاسی مد و جزر، گفت و شنید، جنگ و جدل، جنگ بندی اور حالیہ کشت و خون کے تمام عوامل کو ملحوظ نظر رکھ کر ایک معروضی سیاسی تجزیہ کیا جائے اور ان حالات میں بھی عقل و خرد کو مقدم جان کر اس جنگ و جدل کو فوراً بند کیا جائے تا کہ سب متحارب اور غیر متحارب پارٹیاں کم سے کم ایک پر امن اور غیر متشدد ماحول میں ایک بنیادی سیاسی لائحہ عمل پر متفق ہو جائیں اور گفت و شنید کی سیاسی محفلوں اور میٹنگوں کو از سر نو ترتیب دے کر دوبارہ استوار کیا جا سکے۔[2]

1۔ ماہنامہ بلوچیہ جون ۲۰۰۷ء

2۔ روزنامہ انتخاب ۹ فروری ۲۰۰۶ء اور عوامی دکھ کا سفر حکیم بلوچ ص ۲۰۸

باب چہارم

حکیم بلوچ اور ادبا و ناقدین کی آراء

اور

حکیم بلوچ کے چند اہم انٹرویوز میں سے

ایک یادگار انٹرویو

حکیم بلوچ اور اُدباء وناقدین کی آراء

حکیم بلوچ ایک ممتاز دانشور، ادیب، تجزیہ نگار اور بیوروکریٹ ہیں اور انہوں نے ہر شعبے میں قابل تحسین خدمات سرانجام دیں ہیں۔ اور یہی خدمات آپ کی شخصیت کی وجہ تشریح بن کر آپ کی عظمت کا خود اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور عظیم انسان اپنی اہمیت کے پیش نظر ہمہ وقت لوگوں کی نظروں میں قابل تنقید بن جاتے ہیں اور ان کے بارے میں انصاف کا معیار وہ قائم رکھ سکتا ہے جسے اپنی پرکھ کے ترازو کے لئے علم ودانش کا سنگ مہیا ہو۔ اور یہ سنگ ادبا وناقدین اور دانشوروں ہی کی میراث ہوتا ہے جو انہیں صاحب الرائے ہونے کا تاج پہناتا ہے۔ تو اب آیئے ایسے ہی چند صاحب الرائے شخصیات کا حکیم بلوچ کے بارے میں تاثرات ملاحظہ کرتے ہیں۔

دانیال طریر:

حکیم بلوچ صاحب بلوچستان کی ان شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے علم وادب، تاریخ و سیاست اور عملی اور سیاسی سرگرمیوں جیسی متنوع جہات میں ایک معیار اور وقار کے ساتھ کام کیا ہے۔ اتنی متنوع جہات میں بہ یک وقت کام کرنا اور معیار کو برقرار رکھنا یقیناً قابل تحسین ہے ایک ادبی طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری دلچسپیاں ان کے ادبی کام تک محدود رہی ہیں اس لئے سردست ان کے دیگر کاموں پر میں کوئی رائے نہیں دے سکتا جہاں تک ان کے ادبی کام کا تعلق ہے اس کی تین جہتیں ہیں عطا شاد، افسانہ نگاری نیز تبصرے اور تجزیے۔

حکیم بلوچ صاحب نے شبیہہ شاد لکھ کر عطا شاد پر تنقید کی راہیں ہموار کی ہیں۔ کسی ایک ادبی شخصیت پر مبسوط کام کرنے کی روایت بلوچستان میں قریباً عدم دستیاب ہے۔ اس حوالے سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ عطا شاد کو حکیم بلوچ صاحب نے اس کی فکر اور فنی شخصیت کیساتھ اس کی سوانح اور ذاتی قربت وشناسائی کی روش میں سمجھا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے عطا شاد کی تخلیقی شخصیت کی کلیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے جتن کئے ہیں۔

عطا شاد جیسے مشکل شاعر پر ابتدائی کام کرنے کا اقدام ناقدانہ جرأت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیوں کہ کسی بھی شاعر پر ہونے والا ابتدائی کام اکثر اس پر ہونے والے مزید کام کی سمت متعین کر دیتا ہے۔ یعنی اگر خشت اول درست ہو تو آگے کے تمام کام کی سمت نمائی درست ہو جایا کرتی ہے اگر ابتدائی کام غلط ٹھہرے تو تمام عمر ناقدین اور محققین بھٹکتے رہتے ہیں۔

حکیم بلوچ صاحب نے عطا شاد پر درست ابتداء کر کے عطا شاد پر ہونے والی تمام تر تنقید کے لئے صیح سمت کا تعین کیا۔ جس کے لئے بلوچستان کا ادبی منظر نامہ ان کا احسان مندر ہے گا۔

افسانہ نگاری کی طرف آئیں تو حکیم بلوچ کا رویہ سماجی تجزیہ نگار کا سا نظر آتا ہے اپنے گرد و پیش موجود زندگی کی دھڑکتی ہوئی نبض کو محسوس کرنا اور کہانی کے قالب میں ڈھالنا ان کا عام رویہ ہے تاہم ان کی کہانیوں میں سماجی تجزیے کی گہرائی سرایت کئے ہوئے ہے۔ طبقات میں بٹی ہوئی ہماری زندگی انسانی فکر پر جو نقوش چھوڑتی ہے وہ کہیں واقعے کی صورت میں، کہیں نفسیاتی الجھن کی صورت میں، کہیں کسی مسئلے کے روپ میں تو کہیں کسی کیفیت کا رنگ لیے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کی بلوچستانی اور عالمی سیاسی تاریخ کے مختلف ادوار کو سمجھنے کی خاص طور پر ضرورت پیش آتی ہے ورنہ ان کے بہت سارے افسانے صیح تناظر میں سمجھے نہیں جاسکتے انہوں نے اپنے تخلیقی عمل میں تقلید کی بجائے تخلیق کے رویے کو اپنایا ہے اس لئے ان کے افسانوں پر کسی دوسرے افسانہ نگار کے اثرات واضح طور پر دیکھے نہیں جاسکتے یہ انفرادیت ان کے افسانوں کی الگ شناخت کا مطالبہ کرتی ہے۔

حکیم بلوچ کے تبصرے اور تجزیے کسی خاص تنقیدی دبستان کی افکار کی پابندی کے برعکس ان

کے وسیع اور مختلف الجہت مطالعے کی دین ہیں وہ جب کسی شخصیت، کسی صنف، کسی موضوع یا کسی ادبی مسئلے پر تبصرے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی اپنی شخصیت اس موضوع کے مدمقابل آ کر اس کی حیات کے ماحصل اجاگر کر دیتی ہے۔ ان کے تبصروں اور تجزیوں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر موضوع کا بے لاگ تجزیہ کرتے ہیں یہی صفت انہیں بلوچستان کے دوسرے تجزیہ نگاروں کے مقابلے میں منفرد مقام و ممتاز حیثیت بخشتی ہے۔

حکیم بلوچ کی مجموعی ادبی شخصیت ابھی پوری طرح سامنے نہیں آ سکی ہے۔ اس کی وجہ ان کے ادبی کام کی کمی نہیں بلکہ ہمارے ناقدین و محققین کا غیر منصفانہ رویہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب انہیں مکمل طور پر دریافت کر لیا جائے گا تو وہ بلوچستان کی انگلیوں پر گنی جا سکنے والی منفرد، نمایاں اور ممتاز شخصیات میں سے ایک ہوں گے۔[1]

بیرم غوری:

حکیم بلوچ صاحب ہمارے بزرگوں میں سے ہیں۔ وہ ہمارے لیے بہت قابل احترام ہیں ۔ وہ پاکستان کی بڑی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے انتظامی امور میں ایک اور ایماندار آفیسر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔ آپ تجزیہ نگار بھی ہیں اور ممتاز ادیبوں اور دانشوروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے حکیم بلوچ کم عمری ہی سے ایک قائدانہ صلاحیت رکھنے والا پر جوش اور تعمیری شخصیت کے مالک ہیں ۱۹۶۴ء میں انہوں نے کراچی میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی تنظیم سازی کی اور پھر خود اس تنظیم کے صدر بھی رہے اور ایک نئے جوش ولولے کے ساتھ تعمیری کردار ادا کرتے رہے۔

حکیم بلوچ ایک ترقی پسند اور محرک انسان ہیں آپ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ جہاں اسلامی انتہا پسندی، بے تعلیمی، بدعنوانی، گروہ بندی، سماجی ٹکراؤ حکمرانوں اور سیاست دانوں کی غلط پالیسیاں اور قدامت پسندی جیسے عوامل نے ان کے لئے بے برداشتی کا سامان پیدا کر دیا ہے اور پھر

---

[1] انٹرویو: دانیال طریر صاحب لیکچرار جامعہ بلوچستان شعبہ اردو جمعۃ المبارک ۵ نومبر ۲۰۱۰ دن ۱۱ بجے بمقام جامعہ بلوچستان شعبہ اردو۔

سرداری نظام کی خامیوں پر بھی ان کی کھڑی نظر ہے۔ایسے سوسائٹی میں وہ ایک نیو مائنڈ سٹ کے تحت حالات اور سسٹم کو اکیسویں صدی کے عین تقاضوں کے موافق ڈھالنے کے جتن کر رہے ہیں۔اس کی مثال آپ کو ان کے افسانوں اور دیگر نگارشات میں ملتی ہے۔اور سیاسی حوالے سے بھی انھوں نے عملی طور پر خود مستعد کام کیے ہیں۔اور ان کے اچھے خاصے نتائج بھی نکلے ہیں کیوں کہ حکیم بلوچ کو قدرت نے فطری اور شعوری دونوں صورتوں میں بہترین سیاسی بصیرت سے نوازہ ہے۔وہ سیاسی نبض شناس ہیں خصوصاً بلوچستان کے پیچیدہ مسائل کا کماحقہ حل ان کے پاس موجود ہے۔

ادب کے حوالے سے بھی انہوں نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں ہیں۔انہوں نے اپنے رفقاء صدیق آزاد، امان اللہ گچکی، آزاد جمالدینی اور عطا شاد کی معیت میں بلوچی ادب کی ترویج و ترقی کے لئے تحقیق و تخلیق اور رسائل و جرائد کے اجراء سے بلوچی ادب کو ترقی کی ارتقاع تک پہنچایا ہے۔

بلوچی ادب میں رسم الخط ایک فروعی اختلاف ہے اس ضمن میں حکیم بلوچ کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔بلوچی ادیبوں اور دانشوں میں سے بعض کے نزدیک بلوچی زبان و ادب کے لئے رومن رسم الخط مفید ہے اور بعض عربی رسم الخط ہی کو اس ادب کے لئے موزوں سمجھتے ہیں۔ان گہری علمی مباحث کا حل کوئی Philologist ہی نکال سکتا ہے اور وہ حکیم بلوچ ہی ہیں جو بلوچی اکیڈمی کی سطح پر اس قسم کے مسائل خصوصاً رسم الخط کے مسئلے کا تصفیہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں صبا دشتیاری اور دیگر ادبی شخصیات بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

مجموعی طور حکیم بلوچ ایک تعمیری شخصیت کے مالک انسان ہیں، وہ جس شعبے سے بھی منسلک رہے وہاں انہوں نے اصلاحات اور مثبت تبدیلی لانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور میرے خیال میں ہر ذمہ دار آفیسر، دانشور اور معزز شہری کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔[1]

---

[1] انٹرویو: بیرم غوری صاحب انچارج ادبی صفحہ روزنامہ جنگ جمعۃ المبارک ۵ نومبر ۲۰۱۰ بمقام جامعہ بلوچستان شعبہ اردو دن ۱۲ بجے

عرفان الحق صائم:

حکیم بلوچ صاحب ہمارے عزیزوں میں سے ہیں اور بہت ہی مخلص انسان ہیں میں نہ ان کی ادبی خدمات کے بارے میں بات کرتا ہوں۔ نہ ان کے تبصرے و تجزیوں کے حوالے سے کچھ اظہار کرنا چاہتا ہوں نیز نہ سیاسی اور انتظامی امور و فرائض کے متعلق کوئی رائے دونگا۔ صرف میں اتنا کہونگا کہ جب آپ ایک آفیسر تھے تو ایک ذمہ دار آفیسر تھے۔ اپنا فرض منصبی پوری ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیا۔ جب انہوں نے ادبی کام کا آغاز کیا تو معاشرے میں ایک نیا رجحان مبسوط کیا اور ان کے تجزیے و تبصروں کی تو ثانی نہیں، ایسے بے لاگ جس میں کسی جھجک یا خدشے کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ نیز اگر ان کی سیاسی جہت پر نظر دوڑائی جائے تو آپ ایک انقلابی وژن کے مالک انسان نظر آتے ہیں۔ الغرض میں ان کی ان تمام جہات پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ ان کی خدمات کی تفصیل تو سب پر عیاں ہے ان کے متعلق رائے دینے والے بھی بہت ہیں۔ میں بہت ہی عاجز انسان ہوں میں ان کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ سردست میں صرف ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حکیم بلوچ کو میں ابتدائی دنوں سے جانتا ہوں حکیم بلوچ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کو فطرتاً غرور و تکبر سے بعد ہے حتیٰ کہ جب آپ چیف سکریٹری کے عہدے تک پہنچے تب تک آپ نے ایک بادیہ نشین انسان کی طرح ملنساری وروداری کی روایت کو قائم و دائم رکھتے ہوئے ہر کسی کے ساتھ انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ پیش آتے رہے اور جب کہ اب آپ ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں تب بھی آپ وہی سادہ منش اور پرخلوص انسان ہیں اور آپ کا یہ خلوص نہ صرف انسانوں کے ساتھ ہے بلکہ آپ کو اپنی سرزمین کے ساتھ بھی گہری وابستگی ہے اور شاید آپ کی ایمانداری کا سب سے بڑا راز ہی یہی ہے کہ آپ اپنی سرزمین کے ایک باوفا فرزند ہونے کے ناطے اس ارض مادر کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے۔[1]

---

[1] انٹرویو: عرفان الحق صائم صاحب انچارج جنگ فورم روزنامہ جنگ پیر ۲۹ نومبر ۲۰۱۰ دن ۱۲ بجے بمقام جنگ اخبار دفتر

ڈاکٹر علی دوست بلوچ:

حکیم بلوچ زبان وادب اور ثقافت کی وہ معتبر شخصیت ہیں جو مطالعے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے تاریخ فلسفہ اور مذہب پر ان کی گہری نظر ہے دنیائے ادب میں نئے رجحانات اور رویوں کی بات ہو یا یونانی دیو مالائی حوالے، وہ بے تکان بولتے ہیں کیٹس شلیے اور ملٹن کی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے شعراء میں ن،م راشد فیض احمد فیض اور عطا شاد کی شاعری اور فن پر بھی خوبصورت تبصرہ کرتے ہیں ایک طرف بلوچی رزمیہ اور عشقیہ شاعری پر اپنی ماہرانہ رائے سے نوازتے ہیں تو دوسری طرف شاعر بالاچ اور بانک سیمک کے اشعار کے آئینے میں اپنا تنقیدی نقطہ نظر بھی سامنے لاتے ہیں۔اور ان کے تنقیدی نقطہ نظر میں بڑا وزن ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ ایک وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ ساتھ وہ بڑی باریک بینی سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیقی کام سر انجام دیتے ہیں۔اور یہ بات ان کی شائع شدہ کتابوں میں بدرجہا اتم موجود ہے ان کی دو کتابیں آس ءِ چہرا اور سنگ گراں میں زیادہ تر شائع شدہ مضامین اور تخلیقات شامل کی گئی ہیں اور دیگر کتابیں ان کی تازہ تخلیقات پر مبنی ہیں۔[1]

اکبر بارکزئی:

حکیم بلوچ دور حاضر کے ان سرخیل وکامیاب بلوچ ادیبوں میں سے ایک ہین جو کہ ترقی پسندی جدیدیت اور تبدیلی کے داعی ہیں۔اردو، انگریزی اور بلوچی زبانوں کی کئی کتابوں کے یہ مصنف ایک باز جہت نابغہ تخلیق کار ہیں۔آپ نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔مگر قصہ نویسی اور ادبی تنقید نگاری ان کی قلمی کاوشوں میں مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔آپ افسانے لکھ رہے ہوں یا تنقید، آپ کی نثر اتنی خوش مزاجی سے آگے بڑھ رہی ہوتی ہے جیسا کوئی پرسکون چشمہ آب جو جھرنے کی مانند چٹانوں اور پتھروں کے درمیان خراماں خراماں رواں ہو۔ نثر نگاری کی اپنی خوبیوں کی بدولت آپ کو اس فن تخلیق میں اعلیٰ پائے کے ادیبوں میں گنا جاتا ہے خاص کر بلوچی ادب میں۔آپ کی کہانیاں عام

---

[1]۔ جناب ڈاکٹر علی دوست بلوچ بلوچی دیوان ص ۳۱۰

انسانوں کی زندگی، خوشی اور غم کی تصویر کشی کرتی ہیں خوبصورتی اور کبھی کبھی بدصورتی کی عکاسی کرتی ہیں حکیم بلوچ کو اپنے ہم عصروں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں بلوچی زندگی کی تمام تر جزیات کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ گوکہ وہ بلوچ کلچر اور سماج کے تناظر اور اسی زمینی بود و باش کی گہری وابستگی میں اپنی کہانیاں تخلیق کرتے ہیں مگر ان میں تعصب و خودستائی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ جد و جہد مشقت، سزا و جزا، فتح و نصرت، شکست و ریخت کے تمام اجزا کو ایسے پروتے ہیں کہ انفرادی درد کو سماجی درد میں بدل کر وہ پوری انسانیت کی کہانی رقم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حکیم بلوچ عالمی ادب کی بہترین روایات کے حامل ایسے تخلیق کار ہیں جو یونانی ادب کی کلاسیکی تحریروں اور المیوں سے شروع ہو کر عہد حاضر کی ادبی شاہکاروں تک پھیلی ہوئی ہیں اسی مطالعہ اور نسبت نے ان کی ادبی آفاقیت اور ورلڈ ویو (World View) کو متشکل کر کے کمال فن اور حسن آفاق و ادبی حسن و خوبی کے تمام محاسن کو یکجا کر کے اس کے ذوق سلیم اور استھیٹک فلاسفی کی بنیاد مستحکم کر دی ہے جو انسان دوست بھی ہے اور ترقی پسند بھی۔[1]

سلطان محمود نیازی:

حکیم بلوچ کی ادبی کاوشوں کا اہم ترین پہلو اس کا وسیع مطالعہ اور باریک نکتوں پر اس کی گرفت ہے جو اسے ادبی تجزیہ نگاری پر مائل کرتی رہتی ہے اس کی تحریروں میں ایک طرف تو قرآن فہمی اور صوفیانہ ذوق کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف تاریخ مذاہب سے شناسائی اپنا پرتو دکھاتی نظر آتی ہے اس کی نگارشات میں یونانی اور رومی دیومالائی حوالوں کے ساتھ ساتھ بابل اور نینوا، مصری اور یونانی تہذیبوں کے تذکرے بھی بافراط ملتے ہیں۔ اگر ایک طرف ہابس، روسو، برٹرینڈ رسل اور سارتر کے فلسفیانہ خیالات کا ذکر ہوتا ہے تو دوسری جانب رومی، اقبال، غالب اور بیدل کا رنگ بھی ملتا ہے۔ کہیں وہ فیض، مصطفیٰ زیدی، احمد فراز اور عطا شاد کے فن پاروں پر سر دھنتا پایا جاتا ہے تو کہیں ملٹن

---

[1] اکبر بارکزئی صاحب کی انگریزی تحریری رائے کا ترجمہ حکیم بلوچ کی کتاب (Cobra's votive Kiss) کے سرورق سے ماخوذ

ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس اور شیکسپیئر کی شاعرانہ عظمتوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ میر چاکر خان، میر دودا اور بالاچ کے قصوں پر رائے زنی کرتا ہے تو دوسری طرف حانی شہ مرید اور سمک اور ناتھا خان کی داستانوں پر تنقید و تبصرہ کرتا ہے۔ وہ بڑی فراوانی کے ساتھ فرانسیسی ادیبوں اور تذکرہ نگاروں کے حوالے دیتا ہے تو اسی اعتماد کے ساتھ ٹی ایس ایلیٹ اور آئی۔ اے رچرڈ کے علامتی مفاہیم پیش کرتا ہے۔ وہ باقی بلوچ کی سرگرم جدوجہد پر روشنی ڈالتا ہے تو حسین شہید سہروردی کی سیاسی بصیرت اور اُن کی راہ میں حائل کی گئی رکاوٹوں کو بھی اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی عام شخص کے بس کا روگ نہیں۔ اس کیلئے عمر بھر کی محنت درکار ہے۔ لائبریریوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ اور مستند اساتذہ کے قلمی اور زبانی جواہرا کھٹا کرنا پڑتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر حکیم بلوچ کے حلقہ یاراں میں شامل نہیں رہا لیکن جب کبھی فرصت کے لمحات میں اُن سے ملاقات ہوئی انھیں ادبی فن کاروں کے مطالعہ میں معروف پایا۔ اس کی تحریر کے پیچھے کوئی قلبی وابستگی اور ستائش کا جذبہ نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے کہ حکیم بلوچ ایک وسیع مطالعہ رکھتا ہے۔ اور اس وسیع مطالعے نے اسکی ادب فہمی اور تنقیدی صلاحیتوں کو جلا بخشی [1]

---

[1] سلطان محمود نیازی صاحب روزنامہ جنگ کوئٹہ جمعرات ۱۴ اگست ۲۰۰۱

حکیم بلوچ کے چند اہم انٹریوز میں سے ایک یادگار انٹریو

حکیم بلوچ ایک معروف ادیب، دانشور، نقاد، محقق، تجزیہ نگار اور بیوروکریٹ ہیں۔ جو ربع صدی سے بلوچستان کی ممتا کے بدلے بلوچی، انگریزی اور اردو میں علمی، ادبی اور شعوری خدمات کی موتی بکھیرتے ہوئے پوری دنیا میں ہمارے خطے کی علامت بن چکے ہیں آپ کی شخصیت کی اہمت اور آپ کی خدمات کے پیش نظر مختلف اخبارات ورسائل نے آپ کے انٹریوز شائع کیئے ہیں۔ ان میں سے درج ذیل مجھے تین انٹریوز دستیاب ہوئے ہیں۔

۱۔ جمعرات ۱۰ جنوری ۲۰۰۲ کا انٹرویو جسے روزنامہ مشرق نے چھاپا تھا۔
۲۔ ۱۴ فروری ۲۰۰۱ کا انٹریو جسے جنگ مڈویک میگزین والوں نے شائع کیا۔
۳۔ جمعرات ۳۰ نومبر ۲۰۰۰ کا انٹریو جو مشرق اخبار میں چھپ چکا ہے۔

حکیم بلوچ کے ان انٹرویوز میں سے ایک انٹریو قارئین کے لئے پیش خدمت ہے جسے ۱۴ فروری ۲۰۰۱ء میں جنگ مڈویک میگزین "جہان ادب" صفحے میں شائع کیا گیا ہے۔ جہان ادب صفحے کے انچارج جناب اختر سعیدی کا کہنا ہے۔

"جناب عبدالحکیم بلوچ کا شمار بلوچستان کے اہم دانشوروں میں ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر بلوچی زبان کے ادیب ہیں لیکن اردو اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ انھوں نے پروفیسر کرار حسین جیسے جید عالم اور

شفیق استاد سے انگریزی ادب پڑھا انھوں نے کراچی یونیورسٹی میں ادبیات اور
میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین، پروفیسر صلاح الدین، ڈاکٹر
منظور، ڈاکٹر کلیم مسز مایہ جمیل اور ڈاکٹر اشرف جیسے مستند اساتذہ سے کسب فیض
کیا۔۔۔۔۔۔۔۔

پچھلے دنوں کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا تو ہم نے جناب حکیم بلوچ سے ایک خصوصی ملاقات کی اس دوران ہونیوالی گفتگو سوال و جواب کی صورت میں پیش کی جارہی ہے۔

جنگ: سب سے پہلے ہم آپ کا خاندانی پس منظر جاننا چاہیں گے؟

حکیم بلوچ: میں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جو علمی، مذہبی اور تدریسی حوالے سے گاؤں میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔ مجھے اسکول میں بھی اچھے اساتذہ کی شفقت اور علمی راہنمائی حاصل رہی، انگریزی اور اردو ادب سے روشناس کرانے میں اساتذہ نے بنیادی کردار ادا کیا، فارسی اور عربی کی تعلیم بھی اسی زمانے میں حاصل کی۔ میرے ماموں میرے اتالیق اول رہے اسکول میں عطا شاد، صدیق آزاد اور میں نے اردو کے نامور شاعر اور استاد جناب عبدالواسع کی سرپرستی میں "بزم ادب" کی بنیاد رکھی، اردو اور انگریزی مباحثوں میں شرکت کا آغاز کیا میں نے اپنے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالاحد خان کی زیر نگرانی کیا۔ حافظ سعدی، غالب اور اقبال کو اسکول کے زمانے ہی سے پڑھا ۔ کالج میں پروفیسر کرار حسین سے فیض پایا۔ وہ علم کا بحر بے کراں تھے۔ اُن کے دریائے فیض رساں سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

جنگ: آپ ادب کی طرف کیسے مائل ہوئے۔

حکیم بلوچ: مجھے نہیں معلوم کہ میں ادب کی طرف کیسے اور کب مائل ہوا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اسکول کا ماحول علمی اور ادبی تھا، اساتذہ کی راہ نمائی نے بھی بڑا کام کیا۔ لیکن ادب میرا کل وقتی شوق نہیں رہا، یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے پڑھا زیادہ ہے لکھا کم ہے میں نے بلوچی ادب کے علاوہ انگریزی اور اردو ادب کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ میں ان سب کے باوجود خود

کو ادب کا ایک طالب علم سمجھتا ہوں میں فکشن کا آدمی ہوں، میں نے شاعری کبھی نہیں کی، لیکن شعر پڑھنا اور سننا میری فطرت میں شامل ہے ہم نے ایک زمانے میں "بلوچی ادبی سرکل" قائم کیا تھا، اس کی باقاعدہ ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ جس میں افسانے بھی پڑھے جاتے تھے۔ شاعری بھی سنائی جاتی تھی۔ اُن ہی دنوں ایک سرکاری رسالہ نکلتا تھا جس کو ہمارے دوست امان گچکی ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ ہم نوجوانوں کی نگارشات اس میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ جس سے ہم میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی اور حوصلہ بھی ملا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ بلوچی ادب کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور اس کو تنقیدی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے تھے، بلوچی کے کلاسیکی ادب پر لوگ لکھتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں جو اس کا حق ہے۔ پھر میں نے اور میرے کچھ دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ہم بلوچی ادب کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیں گے، تاکہ وہ لوگوں تک پہنچے میری خواہش یہ بھی تھی کہ میں بلوچی ادب میں تنقید کی روایت قائم کروں میرا پہلا مضمون جو کسی رسالے میں چھپا، وہ تنقید کے حوالے ہی سے تھا۔ میں نے تنقیدی مضامین کے علاوہ کچھ انشائیے اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران لوگوں کی زندگی کو میں نے جس رخ سے دیکھا، اس پر میں نے افسانے بھی لکھے، ریڈیو پاکستان کے لیے ڈرامے بھی تحریر کئے۔ اب میرے پاس لکھنے پڑھنے کے لئے زیادہ وقت ہے۔

جنگ: بلوچستان میں بولی جانے والی دیگر زبانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

حکیم بلوچ: ہمارے ہاں جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ پڑھی بہت کم جاتی ہیں۔ اور پڑھائی تو بالکل نہیں جاتی ہیں۔ جب تک زبانوں کو پڑھایا نہیں جائے گا بات آگے نہیں بڑھے گی۔ یونیورسٹی میں ایک بوگس ڈپارٹمنٹ کھلا ہوا ہے، جس کو "شعبۂ بلوچی" کا نام دیا گیا ہے۔ بلوچستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جانا چاہیے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومتوں نے کئی بار عندیہ بھی دیا اور کوششیں بھی کی گئیں۔ لیکن تمام منصوبے ناکام ہو گئے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کی زبان کو پڑھیں گے نہیں، قریب کیسے آئیں گے، میں نے بلوچی ادب سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا لیکن میری پہلی کتاب اردو میں آئی۔ نئے لوگ زبانیں سیکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ پرانے لوگوں میں یہ بات

نہیں تھی۔ پرانے لوگ آج بھی بلوچستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں کو جانتے ہیں۔ میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ ہر بچے کو حق ہے کہ اسے اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں، قربت کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آرہا ہے۔ جو اپنی زبان سے ناواقف ہے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا، میں ایک واقعہ سناتا ہوں، بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر بہادر خان ایک اپائنٹمنٹ کررہے تھے، میں بھی اس کمیٹی کا ممبر تھا انہوں نے کہا کہ ہم بلوچی میں پروفیسر کی ایک آسامی نکال رہے ہیں۔ اور ایسوسی ایٹ پروفیسرز کو پروموٹ کردیں گے، میں نے کہا کہ بورڈ کے سامنے اسے بلائیں میں اس سے کہوں گا کہ اپنے نام کا ٹرانسلیٹ کرو اگر اس نے کرلیا تو میں اس کے حق میں ووٹ دونگا یہ سب خانہ پری ہوتی ہے۔ نہ یہ لوگ اس کلچر سے واقف ہوتے ہیں، جس میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ صرف اس نام سے ایک شعبہ بنایا ہوا ہے۔ اسی طرح یہاں ایک بلوچی اسٹیڈی سینٹر ہے اس کے تحت ایک " مجلہ " شائع کیا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ریسرچ ورک کرتے ہیں۔ اس میں ایک سینئر سول سرونٹ نے "میر گل خان نصیر" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا، جس میں اس نے اُن کی شاعری پر کم اور ذاتی زندگی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور وہ بھی بالکل بچگانہ انداز میں۔ اس نے اے جی جی کو اسسٹنٹ گورنر جنرل لکھا ہے، اس سے اس کی نالج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی کاروائیاں تو بہت ہی ہو رہی ہیں۔ لیکن حقیقتاً کچھ بھی نہیں ہے بچوں کو اُنکی مادری زبان میں تعلیم دینا ضروری ہے اس سے آپ کا لٹریسی ریٹ خود بہ خود اوپر ہو جائے گا۔ ہمارے اربابِ بست و کشاد کہتے ہیں کہ آپ کا اسکرپٹ نہیں ہے یہ تو ایک بہانہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اسکرپٹ تو ہمارے پاس ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ شوشا بھی چھوڑا کہ ہم رومن میں لکھیں گے، یہ غالباً 1972 کی بات ہے اس کی میں نے اور میرے چند مخلص دوستوں نے بھرپور مخالفت کی میں نے اس صورت حال کے خلاف مقامی اخبارات میں تواتر کے ساتھ مضامین لکھے رسم الخط کا آپ کے کلچر اور آپ کے مزاج سے بڑا گہرا تعلق ہے اب تدریسی ماحول ختم ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی کا طالب علم اور استاد دونوں گھومتے پھرتے ہیں۔ آج کے طالب علم کو بنیادی معلومات بھی نہیں ہیں۔ وہ خط بھی نہیں لکھ سکتے ہم نے پچھلے سال تقریباً سو طالب علموں کے انٹرویوس کئے وہ سب کے سب گریجویٹ تھے۔ اُن میں

سے 80 فیصد کو "بچلر" کی اسپیلنگ نہیں آتی تھی۔ یہ تو ہمارا تعلیمی معیار ہے۔اس ماحول میں آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ادب کا مستقبل کیا ہوگا۔ ہماری تعلیم انتہائی ناقص اور غیر متوازی ہے۔ جب تک آپ ابجد نہیں سیکھیں گے تو قرآن کیسے پڑھیں گے جب ان کو ادب کی ابجد نہیں آئے گی تو کیا پڑھیں گے، کیا لکھیں گے۔ادب کا تعلق دانش سے ہے۔نئی نسل ادب سے بہت دور ہے پرانے لوگوں میں آج بھی ادبی شعور اور ادب سے دلچسپی باقی ہے علم حاصل کئے بغیر ادب کا شعور ناممکن ہے اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ فارسی، اردو اور عربی کو غلط لکھو تو وہ بلوچی بن جائے گی۔لوگ افسانے لکھتے ہیں لیکن اسمیں افسانویت نہیں ہوتی ان کو معلوم نہیں کہ افسانے کا پلاٹ کیسے تیار کیا جاتا ہے۔کردار کیا ہوتا ہے۔وہ تھیم، پلاٹ اور استوری میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، رسائل کسی بھی زبان کے ہوں اُن میں زبان و بیان کی لاتعداد غلطیاں ملیں گی۔جو ادیب اور شاعر ہیں اُن کو معاشرے میں موجود چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں ۔چھوٹے چھوٹے دکھ چھوٹے چھوٹے کرب اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں اُن کو لکھنے پر آمادہ کرتی ہیں۔وہ اُن کو لکھ کر تخلیقی مراحل میں داخل ہوجاتا ہے۔حالانکہ تخلیقی عمل بہت مشکل ہے۔عام لوگوں کو اس کیفیت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ادب زندگی کی قدروں کا امین ہوتا ہے۔وہ ذہنوں کو آسودگی ااور قلب کو طمانیت عطا کرتا ہے۔میں نے ایک نقاد کی تحریر پڑھی اس میں اس نے لکھا ہے کہ "میں نے بہت سی زبانوں کی شاعری سنی ہے۔جن کو مین سمجھتا نہیں تھا۔لیکن اس میں جو ردھم تھا اس سے مجھے محسوس ہوتا تھا" کہ اس میں کیا بات ہے"۔نئی نسل کو ادب سے دور رکھنے میں اساتذہ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔بچوں کا کلاس سے غیر حاضر رہنا تو فطری عمل ہے لیکن آج کے اساتذہ بھی کلاس میں جانا ضروری نہیں سمجھتے وہ صرف وقت گزارنے کے لئے اسکول جاتے ہیں۔یہ بڑی تشویش ناک صورت حال ہے۔ایسے ماحول میں کسی بھی زبان کا طالب علم ادب کی طرف کیسے مائل ہوسکتا ہے۔میں خوامخواہ یہ نہیں کہونگا کہ بلوچستان میں بہت اعلیٰ ادب تخلیق ہورہا ہے۔نئے لوگ جوق در جوق ادب کی طرف آرہے ہیں۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری تخلیقی زندگی میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔لیکن اب دوبارہ لکھنے کی طرف مائل ہوا ہوں اس دور کے ادبی رسائل اور ادبی پروگرام دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔بہ قول کشور ناہید پاکستان واحد ملک

ہے جس میں ان پڑھ بھی کہتا ہے کہ "ہم دانشور ہیں" ہمارے ہاں خود ساختہ دانش وروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے ذہنوں کا فقدان ہے۔

جنگ: آپ کا نظریہ ادب کیا ہے؟

حکیم بلوچ: میرا نظریہ ادب بہت واضح اور دوٹوک ہے میں ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کا قائل ہوں، جس ادب میں زندگی سے فرار کی بات کی جائے میرے نزدیک وہ ادب نہیں۔ اور جس میں زندگی کی اقدار کو عزیز رکھا جائے میں اس ادب کو زیادہ مقدم اور محترم سمجھتا ہوں۔ زندگی کس مقصد کے تحت گزاری جاتی ہے۔ اگر ہمارے ادب میں مقصدیت نہ ہو تو اسے زندگی سے قریب تر کیسے کہا جائے گا۔ ادب، ادیب کے ذہن میں پلتا ہے لیکن اسکی جڑیں نہ صرف آپ کے کلچر میں پیوست ہونگی، بلکہ وہ آپ کے معاشرے، آپ کے ماحول اور آپ کی زمین میں بھی پیوست ہونگی اگر آپ واقعی اس معاشرے کا حصہ ہیں تو ادب کو نظریاتی سرحدوں میں قید نہ کریں۔ ادب آزادی کا علمبردار ہے۔ اسے آزاد ہی رہنے دیا جائے۔ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہوتا ہے۔ یہ اس کا بنیادی حق ہے لیکن وہ اپنا نظریہ اور خیالات دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہ کرے، ادیب کو چاہیے کہ وہ ہر اچھی چیز کو قبول کرے اور بری چیز کو رد کرے خواہ اس کا تعلق کسی بھی نظریے یا گروہ سے ہو۔ مولانا روم نے اک جگہ کہا تھا کہ " بکری جب گھاس کھاتی ہے۔ تو اس سے دو چیزیں بنتی ہیں 1 دودھ 2 خون، دودھ بھی اسی گھاس سے بنتا ہے اور خون بھی۔ لیکن آپ خون نہیں پیتے لیکن اس کو دودھ میں تبدیل کرنے کیلئے بکری کو اپنے پیٹ میں بچہ پالنا ہوگا اور پھر اس کو جنم دینا ہوگا یہ دودھ اس بچے کے لیئے ہے لیکن ہم بھی استفادہ کرتے ہیں۔ میرا نظریہ مولانا روم کے نظریے کے عین مطابق ہے۔ ادب تو لوگوں کو نئی زندگی دیتا ہے ادب کا کام صحیح صورت حال کو سامنے لانا ہے۔ یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ تخلیق کار کا تعلق فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبے سے ہو، اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔ اور ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جو تمام لوگوں کے لئے روشنی کا باعث ہو۔

جنگ: بلوچستان میں تنقید کی کیا صورت حال ہے؟

حکیم بلوچ: بلوچستان کی ہر زبان میں تنقید کا خانہ خالی ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ تنقید کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ تنقید کے بغیر یہ اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ کس تخلیق کا معیار کیا ہے تخلیق میں اچھائی کیا ہے برائی کیا ہے۔تنقید دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دیتی ہے۔تنقیدی مراحل سے گزرے بغیر اعلیٰ ادب کی شناخت مشکل ہے تنقید ایک مثبت عمل ہے جس کی ہر شعبہ زندگی میں ضرورت ہے۔ادب بھی معاشرے ہی کا حصہ ہے،اس لئے ادب بھی تنقید کے بغیر ادھورا ہے۔بلوچستان کی کسی بھی زبان میں تنقید کا رجحان نہیں ہے۔جب تنقید کا رجحان بڑھے گا تو نقاد پیدا ہونگے تنقیدی نشستوں سے بھی تنقیدی شعور پروان چڑھتا ہے۔ہمارے ہاں ابھی تک تنقیدی نشستوں کا رواج نہیں ہے۔گزشتہ دنوں یہاں "جنگ حلقہ ادب" نے تنقیدی نشست کا اہتمام کر کے پیش رفت کی ہے۔
خدا کرے یہ روایت مزید آگے بڑھے۔[1]

---

[1]۔ جنگ مڈ ویک میگزین ۱۴ فروری ۲۰۰۱

باب پنجم

نتائج وماحصل

ماحصل

کائنات میں یہ امر مسلم ہے کہ ہر ابتداء اپنے منطقی نتیجے پر پہنچتی ہے ہر سفر کے آغاز کی ایک منزل متعین ہوتی ہے اسی طرح جب انسان اپنی لگا تار محنت استقلال اور جذبہ سے اپنی زندگی کے کٹھن ارتقائی مدراج کو طے کرتا ہوا ترقی کی منزل پر منتج ہوتا ہے تو اس کی شخصیت خود اپنی وجہ تشریح بن جاتی ہے۔ حکیم بلوچ کا شمار بھی اُن شخصیات میں ہوتا ہے جن کی شخصیت اپنی شناخت آپ ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہیں۔ مگر یہاں محض اُن کی معروف شخصیت کو قلم و قرطاس کے حوالے کر کے اُن کی شخصیت کی اہمیت و انفرادیت کا ادراک پیدا کرنا مقصود ہے۔ قطع نظر اسکے کہ اُن کی پوری شخصیت کو دریافت کرنے اور اُن کا مقام متعین کرنے سے میں عاجز ہوں مگر تحقیق ھذا میں شامل ابواب کی روشنی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس پوری بحث کے آئینے میں حکیم بلوچ کس نوعیت کی شخصیت نظر آتے ہیں۔

حکیم بلوچ نے جس خاندان میں آنکھو لی وہ خاندان تاریخی لحاظ سے ایک با کردار اور معتبر خاندان ہے اس لحاظ سے حکیم بلوچ ایک باوقار باعزت اور خاندانی شخصیت نظر آتے ہیں اور آپ نے اپنی خاندان کے جس ماحول میں پرورش پائی وہ ایک علمی ماحول تھا جس کے اثرات نے آپ کو بچپن ہی سے تعلیم یافتہ ہونے کا اعزاز بخشا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول نے آپکی شخصیت کو آپکی متعین کردہ منزل تک پہنچا دیا۔

آپ نے اپنی خدمات کا آغاز اطلاعات و نشریات سے کرتے ہوئے چیف سکریٹری کے عہد

ے تک پہنچ گئے جہاں آپ کو بیور کریٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں، طالب علمی کے دور میں آپکی تنظیم سازی اور پھر اُن تنظیموں کی صدارت کرنے سے آپ کم عمری ہی میں ایک قائد کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اور آپ کی انہی صلاحیتوں کے پیش نظر مختلف ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز بھی آپ کو حاصل رہا ہے۔ اس کے علاوہ ممبر بورڈ آف ریونیو لیبر یونین، ممبر بلوچستان بار کونسل اور بلوچستان ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن، ممبر بلوچی اکیڈمی رہنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر شعبے کو حکیم بلوچ کی خدمات کی ضرورت رہتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ آپ کے ہاں صلاحیت اور نالج کی تو پہلے سے بہتات تھی مگر دنیا کے بیس سے ذائد ممالک کے مشاہداتی دوروں نے آپ کو بین الاقوامی سطح پر ایک معروف اور تجربہ کار شخصیت کی حیثیت سے متعارف کروایا۔

حکیم بلوچ نے ابتدائی ادبی شخصیات، عطا شاد، صدیق آزاد، میر گل، خان نصیر، میر مٹھا خان مری، ملک محمد پناہ سردار خان گشکوری، کریم دشتی، عنقا اور امان اللہ گچکی کی معیت میں اپنے ادبی سفر کا آغاز ڈرامہ نویسی اور ترقی یافتہ زبانوں کے ادبی فن پاروں کو بلوچی زبان میں ترجمے سے کرتے ہوئے تنقید نگاری و فکشن نویسی تک رسائی حاصل کی۔ آپ انسان دوستی، حب سرزمین، سامراج دشمنی، غلط اور قدیم رجحانات، عوامی زندگی کی حالت زار، ظلم و استبداد اور بلوچ کے معاشرتی اور تہذیبی خدوخال کو جس نصب العین سے اپنے فن پاروں میں برتتے ہیں، اس میں آپ ترقی پسند تحریکوں کی صف میں قیام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آپ کی یہ ترقی پسندانہ شخصیت آپ کو دوسرے ادیبوں سے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ حکیم بلوچ کے افسانوں میں ان کی اپنی سرزمین نظر آتی ہے اُن کی افسانے اُن کی اپنی سرزمین کی تہذیب و ثقافت، تاریخ، حکمرانوں کے ظلم و استبداد اور غلط پالیسوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے ذہنی و نفسیاتی الجھنوں، طبقاتی نظام حیات اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے نقصانات، موجودہ قبائلی نظام سے ابھرنے والے منفی رجحانات اور اکیسویں صدی کے تقاضوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

حکیم بلوچ کے افسانوں میں حقیقت نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ اپنے افسانوں میں معاشرتی زوال کی وجوہات کو برآمد کرنے کے لئے ایک حقیقت نگاری کی حیثیت سے ابھر

کر سامنے آتے ہیں۔آپ اپنے افسانوں میں منافقت اور دوغلا پن سے عاری ہو کر دوٹوک لہجہ استعمال کرتے ہیں۔

حکیم بلوچ کی حقیقت نگاری استحصالی نظام کے خلاف ایک بغاوت ہے آپ کے افسانوں میں حقیقت بیانی اس طرح نظر آتی ہے گویا آپ بھی اپنے افسانوں کے کرداروں میں سے ایک کردار ہیں۔ظلم و بربریت کی چکی میں پستے لوگوں کی جہنم جیسی زندگی کو آپ بہترین مرقعے میں پیش کرتے ہیں۔

حکیم بلوچ اپنے افسانوں میں عسکری بادشاہت کے تحت ظلم واستبداد کے زیر اثر پیدا ہونے والے سماجی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں کو نہ صرف اجاگر کرتے ہیں بلکہ آمرانہ نظام حکومت کے جو بھی مفاسد ہو سکتے ہیں اُن کی بہترین انداز میں تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ کہ آمریت میں ریاست کے پورے سسٹم پر ایک ہی فرد واحد مسلط ہوتا ہے اور اس ریاست میں قانون اور آئین محض آمر کی ذاتی خواہشات کا نام ہوتے ہیں۔اور حق پرستوں کی وہ آواز جو نفاذ انصاف کے لئے اُٹھتی ہے اس کو نہ صرف کچلا جاتا ہے بلکہ حق کی آواز بلند کرنے والوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

حکیم بلوچ کے افسانے بلے ہی بلوچ سماج وثقافت کے تناظر میں لکھے گئے ہیں مگر کہیں بھی بلوچ ستائی اور تعصب کا شائبہ نہیں ملتا ہے۔پس اُنکے افسانوں میں ہر خطے کے مغلوب ومظلوم عوام کی حمایت نظر آتی ہے۔

حکیم بلوچ اپنے افسانوں میں تاریخ نویسی بھی کرتے ہیں۔وہ عہدی دور کے علاوہ ماضی کے نوآبادیاتی دور میں سامراجی افواج کی کامیابی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ایک تاریخ نویس نظر آتے ہیں۔اُن کے مطابق اُن نوآبادکاروں کا اس سرزمین پر قیام کرنے اور یہاں کی عوام کا استحصال کرنے میں اسی سرزمین کے کچھ خوشامدی تھے جو اس دور میں آستین کا سانپ بنے ہوئے ہوتے تھے ۔مگر دوسری طرف وہ اُن حلقۂ شیاطین کا سرزمین بلوچستان سے بھاگنے کو بھی اسی سرزمین کے مکینوں کی جدوجہد قرار دیتے ہیں۔جس کی مثال اُن کے افسانے ''داغ زدہ روح'' میں ملتی ہے کہ ایک راہنما

نوآبادیاتی اور سامراجی افواج کے خلاف جو تحریک چلاتا ہے مگر وہ اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کا اپنا بھائی ہی اسے اُن شیاطین کے حوالے کر دیتا ہے مگر دغا اور دھوکے کا یہ تسلسل جب تیسری نسل تک پہنچتا ہے تو اس تیسری نسل کی ایک تعلیم یافتہ عورت کا کردار جس مزاحمتی تحریک کے ساتھ برتا گیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک فخریہ باب ہے۔

تنقید پر امان اللہ گچکی کی طرح حکیم بلوچ نے بھی قابل تحسین خدمات سرانجام دی ہے اور آپ نے تنقید کے معیار کو خوش اسلوبی سے قائم رکھا ہے۔ شبیہہ شاد، ماتم دانش اور سنگ گران اس کی بہترین مثالیں ہیں حکیم بلوچ اپنا ایک جداگانہ تنقیدی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں ہیں بلکہ تنقید برائے زندگی کے قائل ہیں۔ قطع نظر اسکے کہ حزب الشیاطین کی طرف سے آپ کے دو ٹوک اور اصلاحی تنقید کے خلاف غصے کے آگ بڑھک اُٹھتی ہو۔

حکیم بلوچ اپنی تنقیدی نگارشات میں ایک ترقی پسند اور انصاف منش مفکر نظر آتے ہیں کبھی ماتم دانش میں آپ مغرب کی سیاسی و حربی بالادستی کے خلاف مشرق کے رجحانات پر سر دھنتا ہوا نظر آتے ہیں تو کبھی شبیہہ شاد میں آپ نے عطا شاد کے اشعار سے اُن کو ترقی پسندانہ سوچ کے ساتھ ہر ظالم و جابر اور قابض قوت کے خلاف آزادی اور انصاف کیلئے متحرک ہیرو کے تناظر میں پرکھا ہے۔ جس میں T.S. Eliot، ملٹن، ورڑز ورتھ، اور آئی اے رچرڈ کی تنقیدی تفہیمات جیسی خصوصیات آپ کو ایک آئیڈیل نقاد منوالیتی ہیں۔

حکیم بلوچ ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ آپ نے ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں اپنے ریڈیائی ڈراموں کو ریڈیو پاکستان میں پیش کر کے اس خطے میں ڈرامہ نگاری کی اسلوب شناسائی کی راہ ہموار کر دی۔ حکیم بلوچ نے جو ڈرامے ریڈیو پاکستان کے لئے لکھے تھے وہ سب بلوچی میں ہیں۔ جن میں آس ءِ چہر، روچ تہارانت، زرءِ چول، لالہ اور کیلگاں بانوری سرے گوپتہ کو ۲۰۰۰ میں بلوچی اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

حکیم بلوچ کے ڈارمے انحطاط پذیر معاشر کی نیم منہدم عمارتوں کو تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں اور پھر یونانی المیوں، لاطینی پلاٹ نگاری اور انگریزی مکالمہ نگاری حکیم بلوچ کے ڈراموں کو ایک خاص انفرادیت عطا کرتی ہے۔

حکیم بلوچ بہ یک وقت بین لاقوامی سیاست ملکی و علاقائی صورت حال اور بلوچستان کے تصفیہ طلب مسائل و تنازعات کا سیاسی و تاریخی تناظر میں تجزیہ کرتے ہیں۔

بین الاقوامی سیاست پہ حکیم بلوچ جس طرح تجزیہ نگاری کرتے ہیں اُس کا محور امریکہ اور اس کا پروردہ اسرائیل نظر آتا ہے۔ حکیم بلوچ عراق، مشرق وسطیٰ، ایران اسرائیل، امریکہ، افغانستان اور مسئلہ کشمیر کے موضوعات پر تجزیہ اور تبصرہ کرتے ہیں۔ آپ امریکہ کا عراق و افغانستان پر حملوں، ماضی میں ایران و عراق کو لڑانے میں امریکہ و اسرائیل کا طاغوتی ہتھکنڈوں کے استعمال، امریکی ایما پر مشرق وسطیٰ پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ اور اب امریکہ کا مشرق کی جانب رخ کرنے کی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے موضوعات پر جس طرح سے تجزیہ و تبصرہ کرتے ہیں اس میں پوری دنیا کی نہ صرف موجودہ سیاست واضح ہو جاتی ہے بلکہ مستقبل کے حالات واقعات کا بھی ادراک پیدا ہوتا ہے۔ جس سے حکیم بلوچ کی مستقبل بینی اور صاحب بصیرت ہونے کا ایک نیا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ آپ امریکہ کا طاقت کے بل بوتے پر غرور کے نشے میں مظلوم اور نہتے شہریوں کا قتل عام کرنے، اسکے سامراجی و توسیع پسندانا عزائم اور امریکہ کے خوف سے عالمی برادری کا اُن کی طرف جھکاؤ کے تناظر میں "امریکی غرور کدوں پر ابابیل کی یلغار" کے عنوان سے موجودہ عالمی حالات واقعات کی روشنی میں امریکہ کی تباہی کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کے مطابق تاریخ سے کوئی ایسی قوم کی سالمیت کا ثبوت نہیں ملتا ہے جس نے تکبر و غرور کی سیاست کی ہو۔

مسئلہ کشمیر کے متعلق حکیم بلوچ کا نقطہ نظر دوٹوک اور واضح ہے اُن کے مطابق یہ خیال کہ بھارتی فوج سویت یونین کی طرح شکست و ریخت کا شکار ہو کر جنت نظر کو چھوڑ جائیگی، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ سویت یونین کو اگر شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس آگ کی بڑھک کا نتیجہ تھا جو آج تک افغان سرزمین پر نہیں بجھی ہے۔ مگر جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے۔ اس میں نہ کوئی راستہ متعین ہے۔ اور نہ ہی

مقصد اور نصب العین پر استقلال نظر آتا ہے۔

حکیم بلوچ ملکی سیاسی حالات پر بے لاگ تجزیہ کرتے ہیں۔ آپ حکمرانوں کو اُن کے ماضی کی غلطیوں کی یاد دہانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ عہدی دور کی سیاسی خامیوں کو ماضی کے حکمرانوں کی متعین کردہ غلط سمت قرار دیتے ہوئے موجودہ حکمرانوں کو دانش مندی سے کام لینے اور ماضی کی غلطیوں کو دوبارہ دہرانے سے پرہیز کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ آپ جمعرات 10 جنوری 2002 کے پینل انٹریو میں سقوط ڈھا کو کورس میں شامل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ مشرقی پاکستان جو ماضی کے حکمرانوں کی غلطیوں کا خمیازہ ہے اس کا ادراک نئی نسل کو بھی ہو اور آئندہ ماضی جیسی غلطیوں کے نقصانات سے ملک کو محفوظ رکھا جا سکے۔ حکیم بلوچ اپنے ملکی تجزیوں اور تبصروں میں ہر دور خصوصاً غلام محمد ایوب خان اور سکندر مرزا سے لیکر بھٹو دور حکومت کے تمام سیاسی بدعنوانیوں کا غیر جانب دارانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ جو کہ صحافتی میدان میں گران قدر خدمات کا ثبوت ہے۔

حکیم بلوچ تعلیم کے شعبے کو بھی نہیں بھولتے ہیں۔ آپ ارباب بست وکشاد اور دانایان قوم سے گزارش کرتے ہیں کہ علمی فنی اور تعلیمی مسائل کو سیاسی مسائل کی طرح گلیوں میں گھسیٹنے اور بیان بازی کی بجائے حلقہ علم ودانش کے لئے چھوڑ دیں اور وہ اُن کو اس طرح حل کرینگے جو اُنکی ریت ہے۔ بہ حیثیت دانشور حکیم بلوچ بچوں کو انکی مادری زبان میں تعلیم دینے کے حق میں نظر آتے ہیں آپ کے مطابق بچے اپنی مادری زبان میں زیادہ سمجھ سکتے ہیں اور اُن کی تخلیقی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔

حکیم بلوچ فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کے سخت خلاف ہیں۔ اور آپ کا مذہبی نظریہ فرقہ واریت وانتہا پسندی کی سب بڑی انفرادیت یہ ہے کہ آپ قادیانیوں اور احمدیوں کے اقلیت قرار دینے کو فروغ فرقہ واریت کا وش تعبیر کرتے ہیں۔ آپ کے مطابق بحیثیت ایک سچے مسلمان آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ختم نبوت پر یقین نہ رکھنے کی سزا اس دنیا میں سماج اور آخرت میں اللہ دے گا۔ مگر ایسے معاملوں میں مذہب کو اسٹیٹ کا ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں آپ قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا پیش رو مولانا مودودیؒ کو قرار دیتے ہیں اور خصوصاً وزیر اعظم لیاقت علی خان اور ذوالفقار علی بھٹو پر آپ

کھڑی تنقید کرتے ہیں کہ انہوں نے قرارداد مقاصد کے لئے مولانا مودودیؒ ہی کو چنا اور اسے آئین سازی کی بنیاد بنایا جن کی جماعت کے نظریات بعد میں پاکستان کے تمام آئینوں پر اثر انداز ہوتے رہے۔

حکیم بلوچ جب بلوچستان کے سلگتے مسائل و تنازعات کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں آپ ایک تاریخ نویس کے روپ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔آپ ماضی اور حال دونوں کے تناظر میں بلوچستان کے ساتھ ناانصافی اور بلوچستان کے مسائل پر کماحقہ سیاسی اور تاریخی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ جس سے عوام الناس خصوصاً علم سیاسیات و تاریخ کے طالب علموں کو بلوچستان کے پیچیدہ سیاسی اور تاریخی حقائق کا ادراک ہوسکتا ہے۔

حکیم بلوچ اکبر بگٹی کی شہادت کو ظلم و آمریت منشوں کا بلوچ قوم کو کمتری کا احساس دلانے اور ماتم منانے پر مجبور کرنے اور خود جشن ماہتاب منانے کا زعم قرار دیتے ہیں۔مگر حکیم بلوچ نواب صاحب کی شہادت پر ماتم منانے کی بجائے ان کی شہادت کو کامیابی و کامرانی کا ذریعہ تعبیر کرتے ہیں۔

حکیم بلوچ بلوچستان کے ابتدائی خدوخال اور تاریخی حقائق بیان کرتے ہوئے جس نکتے کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ یہ کہ وہ کون سے عوامل تھے اور کون سی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کو اپنی مستقل آزادی اور خودمختاری کے استحکام سے محروم ہونا پڑا۔

بلوچستان دو صدیوں سے اپنے وسائل اور حقوق سے محروم ہے۔حکیم بلوچ اُن کی ماضی میں بنیادی وجوہات بیرونی قوتوں کی اپنے مفادات کی خاطر مداخلت اور اس خطے میں خان و سرداروں کی باہمی چپقلش بتاتے ہیں۔مگر اس ضمن حکیم بلوچ ماضی و حال کا ایک تقابلی جائزہ لیتے ہوئے گلہ مند نظر آتے ہیں کہ آپ کے ہاں ماضی کی استحصالی قوتیں اتنا ظالم اور سفاک نہیں تھے جتنا کہ عہدی دور کے نظر آتے ہیں۔اُن کا نقطہ نظر اُن کی کتاب بلوچ قومیت، خانیت و سرداریت سے یوں واضح ہوتا کہ ماضی یعنی ۱۳۰ سال پہلے پنجاب کے انگریز آفیسروں نے بلوچوں کے مسائل کو حل کرنے کیلئے حکومت خان اور سردار کے درمیان الجھنوں کو سلجھانے کیلئے فوجی حملوں کو ذریعہ نہیں بنایا مگر آج پنجاب کے مسلمان آفیسر (فوجی) صرف فوجی طاقت کے ذریعہ ان مسائل کے حل کو مقدم جانتے ہیں۔

حکیم بلوچ کی تجزیہ نگاری جہاں مآخذ سیاسی و تاریخی علم کا کما حقہ ادراک ہے وہاں آپ کے تجزیوں اور تبصروں میں ادبی و تخلیقی، دینی و فلسفیانہ محاسن قاری کی دلچسپی کو دو چند کر دیتے ہیں۔ جس سے مطالعے کی تشنگی مزید بڑھتی چلی جاتی ہے۔

چونکہ حکیم بلوچ ایک ادبی شخصیت ہیں اور اُن کے تجزیوں اور تبصروں میں بھی ادبی رنگ نمایاں ہے۔ آپ کی تجزیہ نگاری میں انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیئر کی ڈرامہ نگاری کا اسلوب نظر آتا ہے۔ جن کے کردار اکثر امراء و رؤسا اور طبقہ اشرافیہ ہوتے ہیں جس میں جنم لینے والا المیہ ڈرامے کو ایک دلچسپ موڑ سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اسی طرح حکیم بلوچ اپنی تجزیہ نگاری میں استحصالی قوتوں اور اشرافیہ کے مابین کردار نگاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم اُن کی کتاب "عوامی دکھ کا سفر" ص ۲۲۷ پر اُن کا مضمون "امریکہ ایران اسرئیل" ملاحظہ کریں تو اس میں امریکہ ولن، ایران ہیرو اور اسرائیل لومڑی کے کردار میں نظر آتا ہے۔ باقی ہر کردار (ہر دوسرا متعلقہ ملک) امریکہ کے سامنے کسی نہ کسی المیے کا شکار ہو کر ہارا ہوا نظر آتا ہے۔

حکیم بلوچ اپنے تجزیوں تبصروں کو محاروں، تشبیہات و استعارات اور بہترین ضرب الامثال کے علاوہ جا بجا شعراء کے کلام سے مزین کرتے ہیں۔

چونکہ حکیم بلوچ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کی ابتدائی تعلیم دینی علوم سے ہی ہوئی ہے اسلیئے آپ کی تجزیہ نگاری میں دینی رنگ نمایاں نظر آتا ہے مثلاً روزنامہ مشرق ۲۴ اپریل ۲۰۰۲ کے اخبار میں آپ کے ایک مضمون کا عنوان "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو" قرآن پاک کی سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۰۳ کا ترجمہ ہے۔ آپ اپنی تجزیہ نگاری میں کبھی قرآن کبھی حدیث اور کبھی اسلامی تاریخ کے تناظر میں اس طرح تبصرے اور تجزیے پیش کرتے ہیں۔ کہ کہیں آپ واعظ و مصلح اور کہیں مفسر نظر آتے ہیں۔ جس میں آپ کی فلسفیانہ گفتگو سے آپ ایک اسلامی اسکالر کے روپ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

حکیم بلوچ کے مجموعی فن و شخصیت کو دریافت کرنے کی میری اس پوری کوشش کے باوجود میں

نہیں سمجھتا کہ اُن کے فن و شخصیت کی اہمیت کے پیش نظر میرا یہ کام حرف آخر ہے یا میں نے اُن کی شخصیت کو دریافت کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ بلکہ اُن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ اُن کی شخصیت کے ساتھ پوری طرح انصاف ہو۔

کتابیات

ڈاکٹر علی دوست بلوچ "بلوچی دیوان" گوشہ ادب کوئٹہ ۲۰۰۷ء

حکیم بلوچ "بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت،" گوشہ ادب کوئٹہ ۲۰۰۷ء

حکیم بلوچ "شبیہہ شادا اشاعت دوئم" قلات پبلشر کوئٹہ ۲۰۰۳ء

حکیم بلوچ "زیر سایہ خورشید" انتخاب پبلی کیشنز کوئٹہ ۲۰۰۴ء

حکیم بلوچ "سنگ گراں" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۲۰۰۰ء

حکیم بلوچ "آس ءِ چہر" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۲۰۰۰ء

حکیم بلوچ "Tears of Resurrection". بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۲۰۰۰ء

حکیم بلوچ "عوامی دکھ کا سفر" سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ ۲۰۰۸ء

حکیم بلوچ "ماتم دانش اشاعت دوئم" بلوچیہ لوزانک پبلی کیشنز کوئٹہ ۲۰۰۹ء

حکیم بلوچ "Cobra's Votive Kiss" بلوچیہ لوزانک پبلی کیشنز کوئٹہ ۲۰۰۹ء

حکیم بلوچ "شہیدے شپیں بچکند" بلوچیہ لوزانک پبلی کیشنز کوئٹہ ۲۰۰۹ء

اخبارات ورسائل

روزنامہ جنگ کوئٹہ

روزنامہ جنگ مڈویک میگزین کراچی

کتاب رسالہ اسلام آباد

روز نامہ "ڈان اخبار

روز نامہ ایکسپریس

انٹرنیٹ

گلف نیوز دبئی

http://www.gulf-news.com/Articles

People-Places.asp?ArticleID1913

Weekly Independent

http://www.weeyklindependent.com.pk/Review.htm

انٹرویوز

حکیم بلوچ (پہلا انٹریو) جمعۃ المبارک 1/10/2010 بمقام دفتر مشرق اخبار دن ۱۲ بجے

(دوسرا انٹریو) پیر 1/10/2010 دن 1 بجے

دانیال طریر صاحب لیکچرار جامعہ بلوچستان شعبہ اردو (انٹریو) جمعۃ المبارک ۵ نومبر ۲۰۱۰ بمقام جامعہ بلوچستان شعبہ اردو دن گیارہ بجے۔

بیرم غوری صاحب انچارج ادبی صفحہ روزنامہ جنگ اخبار (انٹرویو) جمعۃ المبارک ۵ نومبر ۲۰۱۰ بمقام جامعہ بلوچستان شعبہ اردو دن ۱۲ بجے

عرفان الحق صائم صاحب انچارج جنگ فورم صفحہ روزنامہ جنگ اخبار (انٹریو) ۲۹ نومبر ۲۰۱۰ بمقام جنگ دفتر اخبار دن 1 بجے

مسودہ

کوائف حکیم بلوچ ص ۴، ۵